ماہنامہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

SEPTEMBER 1985

MONTHLY HAYAT - E - NAU SEP. 1985
BILARIAGANJ AZAMGARH (U.P.)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ حیاتِ نو

ستمبر ۱۹۸۵ء

مدیر

طارق فارقلیط فلاحی

* قیمت فی شمارہ: ۲ روپے ۵۰ پیسے *
* سالانہ زر تعاون ۲۵ روپے *

276121

ترسیل زر کا پتہ: جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڈھ یو۔پی

(مطبوعہ فاران پرنٹنگ پریس فیض آباد)

نقوش حیات نو

اداریہ	قربانی۔ قوموں کے عروج وزوال کا پیمانہ	ایڈیٹر	٣
اسلامیات	قربانی کی حقیقت	ماخوذ	٥
	یوم حج	مولانا ابوالکلام آزاد	١٣
	علم دین کی اہمیت	محی حسن عربی چہارم	٢١
	حضرت ابوسفیان	ابوجاوید	٢٣
ادبیات	اقبال کا ایک پیکر موج دریا	توقیر احمد خاں	٣٢
	شعر الطبیعہ یا نیچرل شاعری	ڈاکٹر محمد یوسف خاں	٣٨
	آئینے کے سو ٹکڑے	ارشاد احمد مخدومی	٣٦
	معلقات سبعہ	عارف اعظمی	٤٢
وفیات	ماسٹر عبدالمجید صاحب	جاوید احمد خاں	٤٧
سوز وساز	جامعۃ الفلاح	ابوالمجاہد زاہد	١٢
	محمدؐ	ابوالمجاہد زاہد	١٣
	غزل	شفیق اعظمی	
فکروخیال	تاثرات جو پرانے نہیں ہوتے	مرسلہ مولانا ابوبکر اصلاحی	٤٢
	حلقہ یاراں	عبدالباری۔ رضوان اللہ	٥١
	جامعہ کے لیل ونہار	ق ایف فلاحی	٥٥

اداریہ

قربانی — قوموں کے عروج وزوال کا پیمانہ

قربانی زبان وادب کا ایک معروف لفظ ہے اور انسانی زندگی کی ایک اٹل حقیقت ہے۔ قربانی فرد بھی دیتا ہے معاشرہ بھی دیتا ہے اور قوم بھی دیتی ہے۔ قربانی عزت وناموس کی حفاظت کے لئے بھی دی جاتی ہے اور دولت واقتدار کے حصول کے لئے بھی۔ اور اس بلند مقصد کے لئے بھی دی جاتی ہے جس کے لئے انسانیت کی تخلیق ہوئی ہے اور جس کو کبھی اعلاء کلمۃ اللہ سے تعبیر کرتے ہیں اور کبھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے اور کبھی رضائے الٰہی سے۔ لیکن رضائے الٰہی ہی صحیح جامع لفظ ہے جس میں تمام تعبیریں سمٹ جاتی ہیں۔ اسی طرح قربانی کبھی وقت کی دی جاتی ہے اور کبھی روپے پیسے کی کبھی نقد جان قربان کرنا پڑتا ہے اور کبھی شدائد ومحن سے گزرنا پڑتا ہے۔ ایسے ہی قربانی کی اہمیت اور قدر وقیمت وقت اور حالات کے لحاظ سے گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے۔ لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا ۚ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ

کہا جاتا ہے کہ قربانی کے بغیر کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی۔ فرد کی قربانی انفرادی زندگی کو بناتی ہے معاشرے کی قربانی معاشرے کو سنوارتی ہے اور قوم کی قربانی اجتماعی زندگی کو بام عروج تک پہنچاتی ہے۔ اور قربانیوں سے فرار فرد کو ذلیل کر دیتا ہے، معاشرے کو بداخلاقی اور پستی کے حوالے کرتا ہے اور قوم کو ذلیل و رسوا کر کے غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ

(آل عمران)

عید قربان قربانیوں کی عید ہے۔ گائے بیل کی قربانی، اونٹ اور بھیڑ بکرے کی قربانی، خواہشات وارادے کی قربانی، جسم وجان کی

قربانی کی حقیقت

قربانی کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی پرانی خود مذہب یا انسان کی تاریخ ہے۔ انسان نے مختلف ادوار میں عقیدت و فدائیت سپردگی و جاں نثاری عشق و محبت، عجز و نیاز، ایثار و قربانی اور پرستش و عبدیت کے جو طریقے اختیار کئے خدائی شریعت نے انسانی نفسیات اور جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے ان تمام ہی طریقے اپنی مخصوص اخلاقی اصلاحات کے ساتھ خدا کے لئے خاص کر دئے انسان نے اپنے معبودوں کے حضور جان کی قربانیاں بھی پیش کیں اور یہی قربانی کا سب سے اعلیٰ مظہر ہے خدا نے اسکو بھی اپنے لئے خاص کر لیا اور اپنے سوا ہر ایک کے لئے اسکو قطعاً حرام قرار دیدیا۔

انسانی تاریخ کی سب سے پہلی قربانی

انسانی تاریخ میں سب سے پہلی قربانی آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہابیل و قابیل کی قربانی ہے قرآن پاک میں بھی اس قربانی کا ذکر ہے۔

"اور انکو آدم کے دو بیٹوں کا قصہ بھی ٹھیک ٹھیک سنا دیجئے جب ان دونوں نے قربانی کی تو ایک کی قربانی قبول ہوئی اور دوسرے کی قبول نہیں ہوئی"

دراصل ایک ہے جس کا نام "ہابیل" تھا۔ دل کی آمادگی سے رضائے الٰہی کی خاطر بہترین دنبے کی قربانی پیش کی اور دوسرے نے جسکا نام قابیل تھا بے دلی سے ناکارہ غلے کا ایک ڈھیر پیش کر دیا۔ ہابیل کی قربانی کو آسمانی آگ نے جلا ڈالا اور یہ مقبولیت کی علامت تھی لیکن دوسری کو آگ نے نہیں جلایا اور یہ مقبول نہ ہونے کی علامت تھی۔

قربانی تمام الٰہی شریعتوں میں

قربانی کا حکم تمام الٰہی شریعتوں میں

قربانی اور — اور شاہراہ حیات کی قربانی

دنیا میں ایسی قومیں بہت کم پائی جاتی ہیں جو اس طرح کی قربانیوں کو عید کے طور پر مناتی ہوں۔

عید قرباں — قربانیوں کی یادگار ہے — حضرت ابراہیم کی قربانی اور حضرت اسماعیل کی قربانی — ایک نے گھر بار چھوڑا، اعزہ واقرباء سے جدائی اختیار کی، شان و شوکت، دولت و امارت کو ترک کیا اور خانماں برباد اللہ کے بھروسہ پر در در کی خاک چھانتا رہا اور پیغام محبت کو عام کرتا رہا اور ایک نے نقد جان نذر کر دی — دونوں نے رضائے الٰہی کے حصول کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا اور بڑی خوشی سے اعلان کیا "ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین"

حضرت ابراہیم اور اسماعیل قربانیوں کے دور خشان نشان ہیں شمس و قمر سے کہیں زیادہ روشن اور ہمالیہ سے بھی زیادہ بلند خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو وہاں تک پہنچنا چاہتے ہیں ابراہیم کی زندگی ہمارے لئے نمونہ ہے (لقد کان لکم فی ابراھیم اسوۃ حسنۃ)

حضرت ابراہیم نے قربانی دی تو اللہ نے اس کو قیامت تک جاری کر دیا اور ان کو دنیا کا امام پیشوا اور رہبر بنا دیا اور حضور نے جب قربانیوں کی تکمیل کی تو اللہ نے دین کو غالب کر دیا۔ اس کو پسند فرمایا اور اس کو قیامت تک کے لئے جاری اور ساری کر دیا فرمایا "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا"

آج دنیا کے تمام ہی مسلمان زندگی کی ہر فیلڈ میں پیچھے ہو گئے ہیں۔ ان کی ہوا اکھڑ گئی ہے ان کا وقار ملیامیٹ ہو گیا ہے اور ان کی زندگی غلاموں کی سطح پر آ گئی ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ اسوہ ابراہیمی کے ترک کر دینے کا نتیجہ ہے اور زندگی کے میدان میں قربانیوں کو ترک کر دینے کا انجام ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے دل ہوا و ہوس کے آماجگاہ بن گئے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو آج پھر براہیمی نظر کی شدید ضرورت ہے اور یہ براہیمی نظر بڑی مشکل سے پیدا ہوتی ہے۔ اے کاش کہ ہم اس پر غور کرتے!

براہیمی نظر پیدا بڑی مشکل سے ہوتی ہے
ہوس سینے میں چھپ چھپ کر بنا لیتی ہے تصویریں

طارق ناز ندوی متعلم

۲۱/۷/۱۹۸۵

ہمیشہ موجود رہا ہے اور ہر اُمت کے نظام عبادت میں اسے ایک لازمی جز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

اور ہم نے ہر امت کے لئے قربانی کا ایک قاعدہ مقرر کر دیا ہے تاکہ وہ ان چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اللہ نے انکو عطا فرمائے ہیں۔

یعنی قربانی ہر شریعت کے نظام عبادت میں موجود رہی ہے۔ البتہ مختلف زمانوں مختلف قوموں اور مختلف ملکوں کے نبیوں کی شریعتوں میں انکے حالات کے پیش نظر قربانی کے قاعدے اور تفصیلات جدا جدا رہی ہیں لیکن بنیادی طور پر یہ بات تمام آسمانی شریعتوں میں مشترک رہی ہے کہ جانور کی قربانی صرف اللہ کے لئے کی جائے اور اسی کا نام لے کر کی جائے۔

فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا

(حج ۳۶)

"پس ان جانوروں پر صرف اللہ کا نام لو۔ جانوروں پر اللہ ہی کا نام لینا بڑا بلیغ انداز بیان ہے یعنی انکو ذبح کرو تو اللہ ہی کے نام سے ذبح کرو اور اسی کے نام پر اسی کی رضا کے نام سے ذبح کرو اور اسی کے نام پر اسی رضا کے لئے ذبح کرو۔ وہی ہے جس نے تمہارے لئے یہ جانور مہیا کئے ہیں۔

وہی ہے جس نے انکو تمہارے لئے مسخر کیا ہے اور وہی ہے جس نے تمہارے لئے ان میں گوناگوں فائدے رکھے ہیں۔

قربانی ایک عظیم یادگار

اس وقت دنیا کے ہر خطے میں مسلمان جو قربانی کرتے ہیں اور ذبح عظیم کا جو منظر پیش ہوتا ہے وہ دراصل حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا فدیہ ہے، قرآن میں اس عظیم قربانی کے واقعے کو پیش کرکے اس کو اسلام، ایمان اور احسان، قرار دیا ہے۔

قربانی دراصل اس عزم و یقین اور سپردگی و فدائیت کا عملی اظہار ہے کہ آدمی کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ سب خدا ہی کا ہے اور اسی کی راہ میں یہ سب قربان ہونا چاہیے یہ دراصل اسکا اشارہ ہوگا، تو ہم اپنا خون بہانے سے بھی دریغ نہ کریں گے، اس عہد و پیمان اور سپردگی و فدائیت کا نام، ایمان، اسلام اور احسان ہے۔ لیکن جب وہ اسمٰعیلؑ انکے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچے تو ایک دن، ابراہیم نے ان سے کہا پیارے

بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔ غور کرو اب کیا ہونا چاہیے، بیٹے نے (بلا تامل) کہا، ابا جان! آپکو جو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالئے، انشاء اللہ آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے آخر کو جب باپ بیٹے دونوں نے خدا کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم نے بیٹے کو منہ کے بل زمین پر گرادیا تو ہم نے ندا دی کہ "اے ابراہیم! تم نے خواب سچ کر دکھایا، ہم احسان کی روش چلنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں، دراصل یہ ایک کھلی ہوئی آزمائش تھی، اور ہم نے ایک عظیم قربانی فدیے میں دے کر اس کو (یعنی اسمٰعیلؑ) کو چھڑوا لیا۔ اور ہم نے پیچھے آنے والی امت میں ابراہیم کی یہ سنت (یادگار) چھوڑ دی۔ سلام ہے ابراہیم پر ہم اپنے فداکاروں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں، بلاشبہ وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھے" (الصّٰفّٰت

(۱۰۲ ۱۱۱)

یعنی رہتی زندگی تک امت مسلمہ میں قربانی کی یہ عظیم الشان یادگار حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا فدیہ ہے، خدا نے اس فدیے کے عوض اسمٰعیل علیہ السلام کی جان چھڑائی کہ اب قیامت تک آنے والے فداکار ٹھیک اسی تاریخ کو دنیا بھر میں جانور قربان کریں اور وفاداری اور جاں نثاری کے اس عظیم الشان واقعہ کی یاد تازہ کرتے رہیں۔ قربانی کی یہ سنت جاری کرنے والے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ تھے اور اسکو تاقیامت قائم رکھنے والے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے فداکار ہیں۔

نبی سے خطاب

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قربانی اور فداکاری کی روح پوری زندگی میں جاری ساری رکھنے کی تعلیم دیتے ہوئے یہ ہدایت کی گئی ہے۔

"کہہ دیجئے کہ میری نماز، میری قربانی میری زندگی اور میری موت سب اللہ رب العٰلمین کے لئے ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں، مجھے اسی کا حکم ملا ہے اور میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں۔ (الانعام)

خدا پر پختہ ایمان اور اس کی توحید پر یقین کامل کے معنی ہی یہ ہیں، کہ آدمی کی ساری تگ و دو اسی کی رضا کے لئے مخصوص ہو اور وہ سب کچھ اسکی راہ میں قربان کرکے اپنے ایمان و اسلام اور وفاداری و جاں نثاری

کا ثبوت دے

قربانی کا حکم ساری امت کیلئے ہے

قربانی کی اصل جگہ تو وہی ہے جہاں ہر سال لاکھوں حاجی اپنی اپنی قربانیاں پیش کرتے ہیں۔ دراصل یہ حج کے اعمال میں سے ایک اہم عمل ہے لیکن رحیم وکریم خدا نے اس عظیم شرف سے ان لوگوں کو بھی محروم نہیں رکھا ہے جو مکے سے دور ہیں اور حج میں شریک نہیں ہیں۔ قربانی کا حکم صرف ان لوگوں کے لئے نہیں ہے جو بیت اللہ کا حج کررہے ہوں بلکہ یہ عام حکم ہے اور سارے ہی ذی حیثیت مسلمانوں کے لئے ہے اور یہ حقیقت احادیث رسولؐ سے ثابت ہے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی شہادت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دس سال تک مدینہ منورہ میں قیام پذیر رہے اور برابر ہر سال قربانی کرتے رہتے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"جو شخص وسعت رکھنے کے باوجود قربانی نہ کرے وہ ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آئے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عید الاضحیٰ کے دن فرمایا جس نے عید کی نماز سے پہلے جانور ذبح کرلیا اسکو دوبارہ اپنی قربانی کرنی چاہیئے اور جس نے نماز کے بعد قربانی کی اس کی قربانی پوری ہوگئی اور اس نے ٹھیک مسلمانوں کے طریقے کو پالیا۔"

ظاہر ہے عید الاضحیٰ کے دن مکے میں کوئی ایسی نماز نہیں ہوتی جس سے پہلے قربانی کرنا سنت مسلمین کے خلاف ہو۔ لامحالہ یہ واقعہ مدینہ منورہ کا ہے اور اسی کی شہادت حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی پیش فرماتے تھے۔ نیز ابن عمرؓ ہی کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عیدگاہ میں قربانی کیا کرتے تھے۔"

قربانی کے روحانی مقاصد

قرآن پاک نے قربانی کے تین اہم مقاصد کی طرف اشارے کئے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ قربانی دراصل وہی ہے جو ان مقاصد کا شعور رکھتے ہوئے کی جائے

۱۔ قربانی کے جانور خدا پرستی کی نشانی ہیں۔ "اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے "شعائر اللہ" قرار دیا ہے۔"

(الحج - ۳۶)

"شعائر" "شعیرہ" کی جمع ہے۔

شعیرہ اس محسوس علامت کو کہتے ہیں جو کسی روحانی اور معنوی حقیقت کی طرف متوجہ کرنے اور اسکی یاد کا سبب اور علامت بنے، قربانی کے یہ جانور اس روحانی حقیقت کی محسوس علامتیں ہیں کہ قربانی کرنے والا دراصل ان جذبات کا اظہار کررہا ہے کہ ان جانوروں کا خون درحقیقت میرے خون کا قائم مقام ہے، میری جان بھی خدا کی راہ میں اسی طرح قربان ہے جسطرح میں اس جانور کو قربان کررہا ہوں۔

۲۔ قربانی اللہ کی نعمت کا عملی شکر ہے۔

"اسی طرح ان جانوروں کو ہم نے تمہارے لئے مسخر کردیا ہے تاکہ تم شکر ادا کرو۔"

خدا نے جانوروں کو انسان کے لئے مسخر فرماکر اس پر عظیم احسان کیا ہے۔ انسان ان جانوروں سے گوناگوں فائدے اٹھاتا ہے ان کا دودھ پیتا ہے ان کے گوشت کو غذا بناتا ہے۔ انکی ہڈی کھال اور اون سے ضروریات کی نوع نوع چیزیں تیار کرتا ہے، ان سے کھیتی باڑی میں مدد لیتا ہے، ان پر بوجھ ڈھوتا ہے، ان پر سواری کرتا ہے اور انکے ذریعے اپنی شان وشوکت کا اظہار کرتا ہے قرآن ان فوائد کی طرف اشارہ کرکے اور ان کی تسخیر کا ذکر فرماکر خدا پرستی اور احسان مندی کے جذبات کو ابھارنا چاہتا ہے اور یہ طرز فکر پیدا کرنا چاہتا ہے کہ جس خدائے بزرگ و برتر نے عظیم الشان نعمت عطا کی ہے، اسی کے نام پر انکی قربانی ہونی چاہیئے، قربانی خدا کی عظیم نعمت کا عملی شکر ہے۔

۳۔ قربانی خدا کی عظمت اور کبریائی کا اظہار ہے۔

"خدا نے اسطرح چوپایوں کو تمہارے لئے مسخر کردیا ہے تاکہ تم اسکی بخشی ہوئی ہدایت کے مطابق اسکی بڑائی اور کبریائی کا اظہار کرو۔"

یعنی ان جانوروں کا خدا کے نام پر ذبح کرنا دراصل اس حقیقت کا اعلان واظہار ہے کہ جس خدا نے یہ نعمت عطا کی ہے اور جس نے انکو ہمارے لئے مسخر کر رکھا ہے وہی انکا حقیقی مالک ہے۔ قربانی اس حقیقی مالک کا شکریہ بھی ہے اور اس بات کا عملی اظہار بھی کہ مومن دل سے خدا کی بڑائی، عظمت اور کبریائی پر یقین رکھتا ہے۔

جانور کے گلے پر چھری رکھ کر وہ اس

حقیقت کا عملی اظہار و اعلان بھی کرتا ہے اور زبان سے بھی جیسے اللہ اکبر اللہ اکبر کہہ کر اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے۔

قربانی کی روح

اسلام سے پہلے لوگ قربانی کرکے اس کا گوشت بیت اللہ کے سامنے رکھتے اور اس کا خون بیت اللہ کی دیواروں پر چھڑکتے تھے۔ قرآن نے بتایا کہ خدا کو تمہارے اس گوشت اور خون کی ضرورت نہیں۔ اس کو قربانی کے وہ جذبات پہنچتے ہیں جو ذبح کرتے وقت تمہارے دلوں میں موجزن ہوتے ہیں یا ہونے چاہئیں۔ قربانی، گوشت اور خون کا نام نہیں ہے بلکہ اس حقیقت کا نام ہے کہ ہمارا سب کچھ خدا کے لئے ہے اور اسی کی راہ میں قربان ہونے کے لئے ہے۔

قربانی کرنے والا صرف جانور کے گلے پر ہی چھری نہیں پھیرتا بلکہ وہ ساری ناپسندیدہ خواہشات کے گلے پر بھی چھری پھیر کر انکو ذبح کر ڈالتا ہے۔ اس شعور کے بغیر جو قربانی کی جاتی ہے وہ ابراہیم و اسمٰعیل علیہ السلام کی سنت نہیں بلکہ ایک قومی رسم ہے، جس میں گوشت اور پوست کی فراوانی تو ہوتی ہے لیکن وہ تقوٰی ناپید ہوتا ہے جو قربانی کی روح ہے۔

"اللہ تعالیٰ کو ان جانوروں کا گوشت اور خون ہرگز نہیں پہنچتا بلکہ اسکو تمہاری جانب سے تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔"

خدا کی نظر میں اس تقوٰی کے جذبات ہوں خدا کے دربار میں وہی عمل مقبول ہے جس کا محرک خدا کا تقوٰی ہو۔

"اللہ صرف متقیوں کا عمل ہی قبول کرتا ہے۔"

اونٹ کی قربانی کا روحانی منظر

"اور (قربانی کے) اونٹوں کو ہم نے تمہارے لئے خدا پرستی کی نشانی بنا دیا ہے اس میں تمہارے لئے خیر ہی خیر ہے، پس انکو قطار در قطار کھڑا کرکے ان پر اللہ کا نام لو اور جب (گر کر) انکے پہلو زمین پر ٹک جائیں تو خود کھاؤ اور انکو بھی کھلاؤ جو مانگنے سے بچتے ہیں اور انکو بھی جو مانگتے ہیں۔" الحج - ۳۶

اونٹوں کی قربانی کا طریقہ یہ ہے کہ انکو ایک قطار میں کھڑا کرکے زور سے انکے حلقوم میں نیزہ مارا جاتا ہے جس سے خون کا ایک فوارہ چھوٹتا ہے اور جب خون نکل چکتا ہے تو وہ زمین پر گر پڑتے ہیں۔ قربانی کے اس منظر کو ذرا تصور میں لائیے اور پھر غور کیجئے جانوروں کی یہ قربانی کیا ہے؟ یہی کہ یونہی اسی طرح ہماری جانیں بھی خدا کی راہ میں قربان ہونے کے لئے حاضر ہیں۔

دراصل یہ قربانی اپنی جان کی قربانی کے قائم مقام ہے اس معنویت کے ساتھ اونٹوں کی قربانی پر غور کیجئے۔ انکے زخمی ہونے، خون بہانے، گرنے اور راہِ خدا میں جان دینے کے منظر پر غور کیجئے۔ ایسا محسوس ہوگا کہ گویا میدانِ جہاد میں خدا پرستوں کی صفیں بندھی ہوئی ہیں، ان کے حلقوم اور سینوں میں تیر پیوست ہو رہے ہیں، خون کے فوارے چھوٹ رہے ہیں، لالہ زار زمین انکی جاں نثاری کا ثبوت دے رہی ہے اور وہ ایک ایک کرکے خدا کے قدموں میں گر کر اپنی جانیں پیش کر رہے ہیں۔

قربانی کا طریقہ اور دعا

جانور ذبح کرنے کے لئے اس طرح لٹایا جائے کہ اس کا رخ قبلے کی جانب ہو اور چھری خوب تیز کر لی جائے جہاں تک ہو سکے قربانی کا جانور خود اپنے ہاتھ سے ہی ذبح کیا جائے اور کسی وجہ سے ذبح نہ کر سکے تو کم از کم اس کے پاس ہی کھڑا رہے ذبح کرتے وقت پہلے یہ دعا پڑھے۔

إِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ
فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ عَلٰى
مِلَّةِ إِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَّمَا
أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ إِنَّ صَلَاتِيْ
وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ
رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ
وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا مِنَ
الْمُسْلِمِيْنَ اَللّٰهُمَّ لَكَ وَمِنْكَ

پھر بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ أَكْبَرُ کہہ کر ذبح کرے، ذبح کرنے کے بعد یہ کہے۔

اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْهُ مِنِّيْ كَمَا
تَقَبَّلْتَ مِنْ حَبِيْبِكَ مُحَمَّدٍ
وَّخَلِيْلِكَ إِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِمَا
الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ۔

قربانی کی فضیلت و تاکید

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کی فضیلت اور اس کے اجر کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

(۱) خدا کے نزدیک نحر کے دن: یعنی

دسویں ذی الحجہ کو قربانی کا خون بہانے سے زیادہ پسندیدہ کوئی عمل نہیں ہے قیامت کے روز قربانی کا جانور اپنے سینگوں، بالوں اور کھروں سمیت حاضر ہوگا اور قربانی کا خون زمین پر گرنے نہیں پاتا کہ خدا کے یہاں مقبول ہوجاتا ہے لہٰذا قربانی دل کی خوشی اور پوری آمادگی سے کیا کرو۔

(۲) صحابہؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ! یہ قربانی کیا چیز ہے۔؟ ارشاد فرمایا۔ یہ تمہارے باپ ابراہیمؑ کی سنت ہے، صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہ! اس میں ہمارے لئے کیا اجر و ثواب ہے؟

ارشاد فرمایا: ہر ہر بال کے بدلے ایک نیکی ملے گی، صحابہؓ نے کہا اور اون کے بدلے یا رسول اللہ! فرمایا ہاں اون کے ہر ہر روئیں کے بدلے میں بھی ایک نیکی ملے گی۔

(۳) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے فرمایا، فاطمہ! اٹھو آؤ اپنی قربانی کے جانور کے پاس کھڑی ہو اس لئے کہ اس کا جو قطرہ خون زمین پر گرے گا اس کے بدلے میں خدا تمہارے پچھلے گناہ بخش دے گا، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا یہ خوشخبری ہم اہل بیت کے لئے ہی مخصوص ہے یا ساری امت کے لئے ہے؟ ارشاد فرمایا ہمارے اہل بیت کے لئے بھی اور ساری امت کے لئے بھی۔

(۴) حضرت ابن بریدہ رضی اللہ عنہ اپنے والد کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر کے دن بغیر کچھ تناول فرمائے نماز کو نہیں جاتے تھے اور عید الاضحی کے دن نماز عید الاضحی پڑھنے سے پہلے کچھ نہیں کھاتے تھے اور جب واپس تشریف لاتے تو قربانی کے جانور کی کلیجی سے پہلے تناول فرماتے تھے۔

(بقیہ: ابو سفیان بن حارثؓ)

ان کا کوئی عہد و پیمان ہو۔ اس وقت انھوں نے اپنے گھر والوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ مجھ پر ذرا میری موت پر آنسو نہ بہانا۔ خدا گواہ ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد میں نے کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا ہے۔ ...... پھر ان کی پاکیزہ روح اس دار فانی کو چھوڑ کر اپنی ابدی آرامگاہ کی طرف پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بقیہ صفحہ پر ۲۰

جامعۃ الفلاح

ابو المجاہد زاہد

جادۂ نورِ حق رسی جامعۃ الفلاح ہے زینتِ بزمِ زندگی جامعۃ الفلاح ہے
مرکزِ علم و آگہی جامعۃ الفلاح ہے

اک بہار جانفزا اک ہرا بھرا چمن اک منار نورِ حق اک چراغ انجمن
اک جہان روشنی جامعۃ الفلاح ہے
مرکزِ علم و آگہی جامعۃ الفلاح ہے

بام و در فلاح کو رنگ ثبات دے خدا جلوۂ ذات دے خدا نورِ صفات دے خدا
قلعۂ دینِ دائمی جامعۃ الفلاح ہے
مرکزِ علم و آگہی جامعۃ الفلاح ہے

محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ابو المجاہد زاہد

محمد مرکزِ اہلِ نظر ہے محمد منزلِ اہلِ خبر ہے
محمد نازشِ جن و بشر ہے محمد عالمی پیغامبر ہے
محمد میرا ملجا میرا ماویٰ محمد میرا مسکن میرا گھر ہے
محمد میرے روز و شب کی زینت محمد میرا سورج ہے قمر ہے
محمد رزم گاہ خیر و شر میں میری تلوار ہے میری سپر ہے
محمد ساری دنیا کا اجالا محمد ساری دنیا کی سحر ہے
خدا بھی جلوہ گر ہے اسکے دل میں محمد جس کے دل میں جلوہ گر ہے
دیکھئے رہگزارِ زندگی میں محمد ظلِ رحمت کا شجر ہے
محمد تک پہنچنا ہی پڑے گا تلاشِ امن دنیا کو اگر ہے

اسی کا دین دینِ حق ہے واحد
اسی کی راہ راہِ معتبر ہے

مولانا ابوالکلام آزاد

یومِ حج

آج ذوالحجہ کی پہلی تاریخ ہے ایک ہفتہ کے بعد تاریخ عالم کا وہ عظیم الشان روز طلوع ہونے والا ہے جبکہ آفتاب کے نیچے کرۂ ارضی کے ہر گوشے کے لاکھوں انسان اپنے خداوند کو پکارنے کے لئے جمع ہوں گے اور ریگستانِ عرب کی ایک بے برگ و گیاہ وادی کے اندر خدا پرستی و عشقِ الٰہی کا سب سے بڑا گھرانا آباد ہوگا۔

وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں زمین
میں قائم کر دے تو ان کا کام
صرف یہ ہوگا کہ صلوٰۃ الٰہی کو
قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں
نیکی کا حکم دیں، اور برائیوں
سے روکیں۔

یہ پہلا گھر تھا جو خدا کی پرستش کے لئے بنایا گیا اور آج بھی دنیا کے تمام بحر و بر میں صرف وہی ایک مقدس گوشہ ہے جو اولیاء الشیطان واصحاب النار کی لعنت سے پاک ہے اور صرف خدا کے دوستوں اور اسکی محبت میں دکھ اٹھانے والوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔

سمندروں کو عبور کرکے پہاڑوں کو طے کرکے کئی کئی مہینوں کی مسافت چل کر دنیا کی مختلف نسلوں، مختلف رنگتوں مختلف بولیوں کے بولنے والے اور مختلف گوشوں کے باشندے یہاں جمع ہوتے ہیں اس لئے نہیں کہ سامی یا ٹیوٹانک نسل کی باہمی عداوتوں سے دنیا کے لئے لعنت بنیں، اس لئے نہیں کہ ایک انسانی نسل دوسری نسل کو بھیڑیوں کی طرح پھاڑے اور اژدہوں کی طرح ڈسے، اس لئے نہیں کہ خدا کی زمین کو اپنے ابلیسی غرور اور شیطانی سیادت کی نمائش گاہ بنائیں۔ اسلئے نہیں کہ تیس تیس من کے گولے پھینکیں۔ اور سمندر کے اندر ایسے جہنمی آلات رکھیں جو منٹوں

اور لمحوں میں ہزاروں انسانوں کو نابود کر دیں، بلکہ تمام انسانی غرضوں اور مادی خواہشوں سے خالی ہوکر اور ہر طرح کے نفسانی ولولوں اور دنیوی شرارتوں کی زندگی سے ماوراء ہو کر، صرف اس خدائے قدوس کو پیار کرنے کے لئے اسکی راہ میں دکھ اٹھانے اور مصیبت سہنے کے لئے اور اس کی محبت و رافت کے پکارنے اور بلانے کے لئے جس نے اپنے ایک قدوس دوست کی دعاؤں کو سنا اور قبول کیا، جب کہ نبی کا گھرانا آباد کرنے کے لئے اور امن و سلامتی اور حق و عدالت کی بستی بنانے کے لئے اس نے اپنے خدا کو پکارا تھا۔

اے پروردگار میں نے تیرے
محترم گھر کے پاس ایک ایسے
بیابان میں جو بالکل بے برگ
و گیاہ ہے، اپنی نسل لا کر
بسائی ہے تاکہ یہ لوگ تیری
عبادت کو قائم کریں۔ پس
تو ایسا کر کہ انسانوں کے
دلوں کو انکی طرف
پھیر دے اور انکی رزق
کا ہمیشہ سامان
کر دے۔

آہ ذرا تم انکی اللہ طلب و غریب حالتوں کا تصور کرو! یہ کون لوگ ہیں اور کس پاک بستی کے بسنے والے ہیں؟ کیا یہ اسی زمین کے فرزند ہیں جو خون اور آگ کی لعنتوں سے بھر گئی، اور صرف بربادیوں اور ہلاکتوں ہی کے لئے زندہ رہتی ہے؟ کیا یہ اسی آبادی سے نکل کے آئے ہیں جو بہیمیت و خونخواری میں درندوں کے بھٹ اور سانپوں کے غاروں سے بھی بدتر ہے اور جہاں ایک انسان دوسرے انسان کو اسطرح چیر پھاڑ رہا ہے کہ آج تک نہ تو سانپوں نے کبھی اسطرح ڈسا اور نہ جنگلی سوروں نے کبھی اسطرح دانت مارے ہیں؟ کیا یہ اسی نسل اور گھرانے کے لوگ ہیں جس نے خدا کے رشتوں کو بے خبر کاٹ ڈالا، اور اس طرح ہر طرف سے منہ موڑ لیا اسکی بستیوں اور آبادیوں میں خدا کے نام کے لئے ایک آواز اور ایک سانس بھی باقی نہ رہی؟ آہ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں یہ قدوسیوں کی سی خصوصیت، فرشتوں کی سی نورانیت اور سچے انسانوں کی سی محبت انہیں کہاں سے آئی ہے؟ تمام دنیا نسلی تعصبات کے شعلوں میں جل رہی ہے۔ مگر دیکھو یہ دنیا کی تمام نسلیں کس طرح بھائیوں اور عزیزوں کی طرح ایک مقام پر جمع ہیں، اور سب کا

ایک ہی حالت، ایک ہی وضع، ایک ہی لباس،
ایک ہی قطع، ایک ہی مقصد اور ایک ہی صدا
کے ساتھ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔
سب خدا کو پکار رہے ہیں سب خدا ہی کے
لئے حیران و سرگشتہ ہیں، سب کی عاجزیاں
اور درماندگیاں خدا ہی کے لئے ابھر آئی ہیں،
سب کے اندر ایک ہی لگن اور ایک ہی ولولہ ہے
سب کے سامنے محبتوں اور چاہتوں کے لئے اور
پرستشوں اور بندگیوں کے لئے ایک ہی
محبوب و مطلوب ہے، اور جبکہ تمام دنیا کا
محور عمل نفس و ابلیس ہے، تو یہ سب صرف خدا
کے عشق و محبت میں خانہ ویراں ہو کر اور جنگلوں
اور دریاؤں کو قطع کر کے دیوانوں اور مجنونوں
کی طرح یہاں اکٹھے ہوئے ہیں! انھوں نے
نہ صرف دنیا کے مختلف گوشوں کو چھوڑا بلکہ
دنیا کی خواہشوں اور دولتوں سے بھی کنارہ
کش ہوگئے۔ اب یہ ایک بالکل نئی دنیا ہے
جس میں صرف عشق الٰہی کے زخمیوں اور سوختہ
دلوں کی بستی آباد ہوئی ہے۔ یہاں نہ نفس کا
گذر ہے جو غرور زندگی کا سہارا بنے، اور نہ
انسانی شرارتوں کو بار مل سکتا ہے جو خونریزی
اور ظلم اور سفاکی میں کرۂ ارضی کی سب
سے بڑی درندگی ہیں۔ یہاں صرف آنسو
ہیں جو عشق کی آنکھوں سے بہتے ہیں۔ صرف
آہیں ہیں جو محبت کے شعلوں سے دھوئیں کی
طرح اٹھتی ہیں، صرف دل سے نکلی ہوئی صدائیں
ہیں جو پاک دعاؤں اور مقدس نداؤں کی صورت
میں زبانوں سے بلند ہو رہی ہیں، اور ہزاروں
سال پیشتر کے عہد الٰہی اور راز و نیاز عبد و
معبود کو تازہ کر رہی ہیں۔

لبیک لبیک، اللھم لبیک، لا شریک
لک لبیک

سرِ روحانیاں داری ولے خود را نہ دیدستی
بخواب خود درآ تا قبلۂ روحانیاں بینی

یہ وہ مجمع ہے جسکی بنیاد دعاؤں سے
ڈلی جسنے دعاؤں سے نشوونما پائی، جو صرف
دعاؤں ہی کے لئے قائم کیا گیا، جسکی ترکیب
بھی اول سے لیکر آخر تک دعاؤں ہی کے
مناسک سے ہوئی، اور جو دعاؤں ہی کی لازوال
طاقت سے قائم ہے۔ سب سے پہلی دعا وہ
تھی جو اس گھر کی بنیاد رکھتے ہوئے خدا کے دو
قدوس دوستوں کی زبانوں پر جاری ہوئی۔

اے پروردگار! ہمیں اپنا
اطاعت شعار بنا اور ہماری نسل
سے ایک امت پیدا کر جو تیری
مومن و مسلم ہو اور ہمیں اپنی

عبادت کے طریقے بتلا دے
اور ہماری توبہ قبول کر لے، تو
تو بہت ہی بڑا توبہ قبول کرنے
والا ہے۔ اور پھر اے پروردگار
ہماری نسل میں ایک اپنا
رسول مبعوث کر جو ان کے
آگے تیری آیتیں پڑھ کر
سنائے اور انہیں کتاب
و حکمت کی تعلیم دے اور ان
کے اخلاق کا تزکیہ کرے!

سو بیابان حجاز کے قدوس لم یزل نے
یہ دعا قبول کر لی۔ اسی اس امت مسلمہ کو پیدا
کیا جو فی الحقیقت وجود ابراہیمی کے اندر پنہاں
تھی۔

بے شک حضرت ابراہیم خلیل
اپنے وجود واحد کے اندر ایک
پوری قوم اور خدا پرست امت
تھی۔

یہ گھر در حقیقت دنیا کی امامت اور
ارض الٰہی کی وراثت کے لئے آباد کیا گیا تھا
اور اسکا عہد و میثاق روز اول ہی بندھ
گیا تھا۔

پس اس مقدس دعا کی قبولیت
نے امت مسلمہ کو بھی قائم کیا اور دنیا کے تزکیہ
اور تعلیم کتاب و حکمت کے لئے سلسلۂ ابراہیمی
کے آخری رسول کو بھی مبعوث کیا نیز جو امامت
و پیشوائی اور خلافت فی الارض حضرت ابراہیم
خلیل علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دی گئی
تھی اسکی وارث انکی ذریت و نسل ٹھہرائی
گئی البتہ بموجب اپنے عہد کے "ظالموں"
کو اس سے محروم کر دیا گیا۔ اس نسل کے جو
لوگ اپنے نفس و روح کے لئے ظالم ہوئے
اور خدا کے مقدس فرشتوں کی اطاعت سے
سرکشی کی ان سے وہ امامت موعودہ بھی
چھین لی گئی اور خلافت موعودہ سے بھی محروم
کر دیئے گئے۔

"پھر ان کے بعد وہ لوگ
ان کے جانشین ہوئے
جنہوں نے صلوٰۃ الٰہی کو
ترک کر دیا اور اپنی نفسانی
خواہشوں کے بندے ہو گئے"

یہ دعاؤں کا وعدہ تھا جسکا ظہور ہماری
اقبال و کامرانی کی تاریخ ہے اور اسی طرح یہ
دعاؤں کا ہی ایک وعید بھی تھی جس
کی سرزنش اور محرومیاں ہماری برگشتگی
اور درماندگیوں کا ماتم ہے۔ وہ ہم پا چکے

جو مثابۃ للناس و امناً کے وارث ٹھہرائے گئے تھے اور پھر یہی ہیں جو آج لا ینال عہدی الظالمین کی تصویر نامرادی ہیں۔

وہ یہ سب کچھ ان اعمال کا
نتیجہ ہے جو خود انھوں نے
اختیار کئے ورنہ خدائے کریم
تو اپنے بندوں کے لئے
کبھی بھی ظالم نہیں ہو سکتا!

پس دعاؤں کا یہ اجتماع لاہوتی، امت مسلمہ کا یہ مجمع مبارک اور روحانیت مقدسہ ابراہیمیہ کا یہ منظر عظیم و جلیل، قریب ہے کہ اسی بیابان حجاز میں ظہور کرے جہاں خدا نے ابراہیم و محمد علیہما السلام پر امامت و خلافت الٰہیہ کے لئے اولین دعا کو سنا اور پھر ہمیشہ دعاؤں کے سننے اور اپنی پکاروں اور نداؤں کے بلند ہونے کے لئے اسے برگزیدہ کر دیا جس وقت یہ پرچہ تمہارے ہاتھوں تک پہنچے گا: اس وقت ذوالحجہ کی تیسری تاریخ ہوگی اور ہو یہ نوروان عشق آباد حجاز کے قافلے کوچ کے لئے تیار ہوں گے۔ اس وقت کا تصور کرو کہ وہ کیسا وقت عظیم ہوگا جب کہ لاکھوں انسانوں کے اندر سے اسوۂ ابراہیمی کی روحانیت عظمیٰ اپنے خداوند کو بے قرارانہ پکار رہی ہوگی اور اس کے مقدس عہد و میثاق کا رشتہ تازہ ہوگا۔ لاکھوں سر ہوں گے جو بے قرارانہ خداوند کے حضور جھکائے جائیں گے، لاکھوں پیشانیاں ہوں گی جو اس کی چوکھٹ پر گرائی جائیں گی اور لاکھوں زبانیں ہوں گی جن سے اس کے حضور میں دعائیں نکلیں گی۔ پھر اس وقت ایسا ہوگا کہ دریائے محبت الٰہی جوش میں آئے گا، ملائکہ مقربین اپنے خلوت وصال کو اپنے دوستوں کے لئے خالی کر دیں گے۔ اور وہ اپنے جمال عالم آرا کے جلوے سے اس تمام محشر عشق و طلب کو ڈھانپ لے گا۔

سوچنا چاہیے کہ اس وقت عظیم و جلیل اور ایام الاجابۃ مخصوصہ کو غنیمت سمجھو، اور تم خواہ کہیں ہو اور کسی حال میں ہو، لیکن اپنی تمام سعی و کوشش کرو کہ تمہاری دعائیں بھی ان دعاؤں کے ساتھ شامل ہو جائیں اور تمہاری بے تابیاں اور بے قراریاں بھی ٹھیک اسی وقت خدا کے حضور رحمت طلب ہوں کہ یہ وقت پھر میسر نہ آئے گا۔ دنیا انقلاب و تجدد کے ایک مہیب عہد سے گزر رہی ہے اور نئے موسم کی علامتوں نے ہر طرف طوفانوں اور زلزلوں کی ایک قیامت کبریٰ بپا کر دی ہے۔ ممکن ہے کہ روز بحر ختم ہونے والا اور عہد وصال کی ایک نئی رات شروع ہونے والی ہو۔ لیکن ضرور ہے کہ دن بھر جن لوگوں نے غفلت کی ہے، وہ اب عین شام کے وقت غفلت نہ کریں۔ کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ شام آگئی ہے اور چراغوں کا اجالا کرنا چاہیے۔

ہاں ہر مومن کو چاہیے کہ وہ یکسر دعاؤں میں ڈوب جائے، دوران مقدس ایام کے اندر صدق دل سے توبہ کرے اور اپنے خداوند سے اپنا معاملہ درست کرے یہ بڑا ہی سخت وقت ہے جس کی نوشتۂ الٰہی میں خبر دی گئی تھی۔ وہ وقت موجودہ اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ آگیا ہے اور زمین اپنے گناہوں کی پاداش میں الٹ دی گئی ہے۔ پس توبہ کرو اور اس کے سامنے اپنی سرکشیوں کا سر مجرموں کی طرح ڈال دو، اور تڑپ تڑپ کے وہ سب کچھ مانگو جو کچھ تمہارا دل چاہتا ہے مگر تمہارے اعمال اسکے سزاوار نہیں ہیں۔ تم اسکے حضور حج کے دن اور عید کی صبح کو جب کہ خلیل اللہ نے اپنے بیٹے کی گردن پر چھری رکھی تھی مسکینوں اور لاچاروں کی طرح گر جاؤ، اپنی سرکشیوں اور نفس پرستیوں کے گوسالہ کو ذبح کر دو اور گڑگڑا کے دعا مانگو کہ خداوند زمین کی سب سے بڑی مصیبت کے سبب سے بڑے عذاب اور انقلاب اقوام و ملل کے سب سے زیادہ مہیب موسم کے وقت ابراہیم و اسمٰعیل کی ذریت کو نہ بھلائیو اور ان کے گناہوں کو معاف کر دیجیو۔

علی الخصوص عید کے دن جب اس کے حضور کھڑے ہو تو اپنے گناہوں کو یاد کرو۔ تم میں ایک روح بھی ایسی نہ ہو جو تڑپتی نہ ہو اور ایک آنکھ بھی ایسی نہ ہو جس سے آنسوؤں کے چشمے نہ بہہ رہے ہوں۔ پھر دیکھو کہ دل کی آہوں اور آنکھوں کے آنسوؤں سے بڑھ کر اسکی درگاہ میں کوئی شفیع نہیں ہو سکتا۔ یعنی جس طرح بھی ہو سکے اپنے خدا کو راضی کرو۔ اور اسے مناؤ، کیونکہ تم نے اپنی بداعمالیوں سے اسے غصہ دلایا اور اسکے حکموں کی پروا نہ کی۔ اور تم یوں پکارو کہ اے ابراہیم اور اسمٰعیل کے خداوند، اور اے رسول امی کے پروردگار ہم نے تیرے عہد کی پروا نہ کی اور اپنی بداعمالیوں تیری مقدس زمین کو ملوث اور گھناؤنا کر دیا۔ لیکن اب ہم اپنی سزاؤں کو پہنچ چکے اور ہم نے بڑا سا دکھ اٹھا لیا۔ ہم مثل یتیم لڑکوں

سے ہو گئے ہیں جنھے والدین کو ان سے جدا کر دیا گیا ہو۔ کیونکہ ہمارا خدا ہم سے راضی نہ رہا اور ہم شرمندگی اور رسوائی کے لئے چھوڑ دیئے گئے۔ پر اے حی و قیوم! اب ہم پر رحم کر ہمارے قصوروں کو معاف کر، اور ہم سے منہ نہ موڑ، ہماری خطائیں بے شمار ہیں لیکن ہم سب تیرے ہی نام سے کہلاتے ہیں اور تیری راہ میں دکھ اٹھانے کے لئے تیار ہیں۔

اگر نہ بہر من از بہر خود عزیزم دار
کہ بندہ خوبی او خوبی خداوند است!

اے ستار و تواب الرحیم! کیا ہمارا غم دائمی ہے، کیا ہمارے خزاں کے لئے کبھی بہار نہیں، اور کیا ہمارے زخم کے لئے کوئی مرہم نہ ہوگا؟ اے فضل و رحم کی کے امید گاہ تو ہمیشہ کے لئے ہمیں نہ بھول اور ہمیں اپنی طرف لوٹا لے ہم تجھ سے ہمیشہ بھاگے ہیں مگر اب ہم تیری طرف لوٹ آئیں گے، کیونکہ ہمیں کہیں پناہ نہ ملی۔

تو ہمیں نیکی اور صداقت کے لئے چن لے اور اپنی ہدایت و عدالت کی تبلیغ کا بوجھ پھر ہماری گردنوں پر ڈال دیا

آج انتہا ترقی کے بعد بھی امن و عدالت کے لئے ویسی ہی تشنہ ہے جیسی عہد صداقت کبریٰ کے اولین عہد جہالت تک تھی۔

[بقیہ عبدالمجید صاحب]

امانت اس کے حوالے کرنے جا رہے ہوں۔ دفن کر کے واپس آ رہے تھے تو قدم کہیں رکھتے اور پیر کہیں پڑتا تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ع

ٹھہر جائے قبر ہم بھی تو آخر مرنے والے ہیں

اس بار علی گڑھ سے گھر آیا تو ماسٹر صاحب نہیں ملے۔ ان کی قبر پر جانے کا اتفاق ہوا۔ قبر دیکھ کر ان کی انسانی شکل نگاہ میں گھومنے لگی۔ میں قبر کے پاس کھڑا تھا۔ آم کی ایک گھنی شاخ اس پر سایہ کئے ہوئے تھی۔ پاس ہی سے پانی کی ایک پتلی سی نہر بہہ رہی تھی۔ دیکھ کر مجھے بڑا اطمینان ہوا۔

[بقیہ: حضرت ابوسفیان بن حارث]

ان کی نماز جنازہ حضرت فاروق اعظم نے پڑھائی۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ اور تمام صحابہ کرام غم سے نڈھال ہو گئے اور ان کی وفات کو اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک زبردست حادثہ شمار کیا گیا۔

مکی حسن ۔ عربی چہارم

علم دین کی اہمیت

انسان فطری طور پر کسی مذہب کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کرۂ ارضی پر رہنے والے افراد مختلف مذاہب کے قائل ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کچھ ایسے بھی خوش نصیب ہیں جو اسلام کو اپنا مذہب تسلیم کرتے ہیں۔ یقیناً اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جسکے ماننے والے دنیا اور آخرت دونوں میں فائز المرام ہوتے ہیں کیونکہ اسلام دین فطرت ہے، اور از روئے عقل و تجربہ وہی ایک ایسا عادلانہ نظام ہے جو انسانی زندگی کی ساری الجھنوں کو کمال حسن و خوبی کے ساتھ سلجھا کر رکھ دیتا ہے اور یہی وہ دین الٰہی ہے جسمیں دونوں جہاں کی فلاح مضمر ہے۔ ہر دور میں یہی مذہب اور اللہ کا یہی برحق دین امراض انسانی کا مسیحا رہا ہے۔

جب اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے اور زندگی کے سارے معاملات میں مشعل راہ ہے نیز اللہ کا برحق دین ہے تو اب ہمارے لیئے ضروری ہے کہ ہم اس کی تعلیمات سے اپنے قلوب کو منور و مجلی کر لیں کیونکہ علم دین وہ سرمایہ حیات ہے جو دنیا اور آخرت دونوں میں سرخروئی و کامیابی کا باعث ہوتا ہے، دنیا میں باطل کے خلاف حجت و برہان قائم کر کے اور آخرت میں ابدی کامرانیوں سے ہمکنار کر کے۔

علم دین کی بہت زیادہ اہمیت ہے کیونکہ زیست کو سنوارنے اور اسے صراط مستقیم پر گامزن کرنے کیلئے جو چیز سب سے زیادہ درکار ہوتی ہے وہ علم دین ہے۔ اسکے حصول کیلئے ہر شخص کو ابھارا گیا ہے۔ کیونکہ جہالت کی موت بدترین موت ہوتی ہے۔ جہالت سے میری مراد اللہ رب العزت اور اسکی صفات سے ناواقفیت ہے ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

فرمایا ”من خرج من الطاعة وفارق الجماعة فمات میتة جاهلية“ جو اطاعت اور جماعت سے خارج ہوا اور اسی حال میں پڑا رہ کر موت آگیا تو گویا وہ جاہلیت کی موت مرا۔ ذرا غور کیجئے الفاظ حدیث پر اسمیں انقطاع جماعت و طاعت کی حالت میں موت کی تشبیہ جاہلیت کی موت سے دی گئی ہے اس سے یہ معلوم ہوا کہ جہالت انقطاع جماعت سے زیادہ ضرر رساں اور باعث خسران ہے کیونکہ مشبہ بہ مشبہ سے وصف مذکور میں اغلب ہوتا ہے۔

انسانی زندگی کی تعمیر میں علم دین بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ قرآن متعدد مقامات پر اسکی اہمیت کو بیان کرتا ہے قرآن علماء کی تعریف بیان کرتے ہوئے ایک جگہ کہتا ہے ”انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء“ (سورۃ فاطر) حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف اہل علم ہی اس سے ڈرتے ہیں، یعنی جس شخص کو اللہ کی قدرت، اسکی حکمت، اسکے علم، اسکی قہاری و جباری اور اسکی دوسری صفات کی جتنی زیادہ معرفت حاصل ہوگی وہ اسکے احکام کی پاسداری کرے گا اور اسکے اوامر کی سرتابی سے خوف کھائے گا۔ درحقیقت اس آیت میں علم سے مراد سائنس، فلسفہ، منطق (Logic)، ریاضی اور تاریخ و جغرافیہ وغیرہ درسی علوم نہیں بلکہ یہاں علم سے مراد ”صفات الہی کی معرفت“ ہے اس آیت میں ”علماء“ سے مراد وہ علماء ہیں جنہیں معرفت الہی حاصل ہو۔ بالفاظ دیگر جو ”علم دین“ سے بہرہ ور ہوں۔ اسطرح سے اس آیت میں ”علم دین“ کی بہت زیادہ اہمیت بیان کی گئی ہے۔

ایک دوسری جگہ قرآن ”علم دین“ کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے ”...... یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات“ (سورۃ مجادلہ ۱۱)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنکو علم (علم دین) بخشا گیا اللہ انکو بلند رتبے عطا فرمائے گا۔ یعنی رفع درجات کا اصل ذریعہ ایمان اور علم ہے۔ اللہ کے یہاں زیادہ بلند مرتبہ اسکا ہے جس نے آپ کی صحبت سے ایمان اور علم کا سرمایہ حاصل کیا اور وہ اخلاق حسنہ سیکھا جو ایک خالص مومن میں ہونا چاہیے یہاں بھی علم کا مطلب ”علم دین“ ہے۔

ایک تیسری جگہ قرآن ”علم دین“ ہی کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ”فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم اذا رجعوا اليهم لعلهم يحذرون۔“

(سورۃ توبہ ۱۲۲)

سو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ انکی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت (جہاد میں) جایا کرے تاکہ باقی ماندہ لوگ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہیں اور تاکہ یہ لوگ اپنی اس قوم کو جبکہ وہ انکے پاس واپس آویں، ڈرا دیں تاکہ وہ احکام الہی کی سرتابی سے پرہیز کریں۔

اس آیت میں باقی ماندہ لوگوں کے رہ جانے کی دینی مصلحت بیان کی گئی۔ اور وہ ”تفقہ فی الدین“ کا کام تھا۔ تاکہ دین میں بصیرت پیدا کرکے وہ قوم کے سرکش لوگوں کو ڈرائیں۔ یہاں ”تفقہ فی الدین“ کا مطلب ”علم دین“ ہے۔

اسی طرح احادیث شریف کی روشنی میں علم دین کی اہمیت اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:—

”ومن سلك طريقا يلتمس فيه علما سهل الله له طريقا الى الجنة۔“

(رواہ مسلم)

اور جو علم کی طلب میں کوئی راستہ طے کرتا ہے اللہ تعالی جنت تک اسکے راستے کو آسان کر دیتا ہے۔

ایک دوسری حدیث جسکے راوی معاویہ ہیں، میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”من یرد اللہ بہ خیرا یفقہہ فی الدین“

جسکے ساتھ اللہ تعالی بھلائی کرنا چاہتا ہے تو وہ اسے علم دین سکھاتا ہے۔

ان دونوں احادیث سے ”علم دین“ کی اہمیت روز روشن کیطرح عیاں ہو جاتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ”علم دین“ کی اتنی زیادہ اہمیت کیوں ہے؟ علم دین کی اتنی زیادہ اہمیت قرآن و حدیث میں اسلئے بیان کی گئی ہے کیونکہ اسکے بغیر تعمیر زیست ممکن نہیں۔ ظاہر سی بات ہے جب کسی کو دین کا علم ہی نہیں ہوگا تو وہ اسکے مطالبات و مقتضیات کو کیسے پورا کر سکے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا میں جانوروں سے بھی زیادہ بدتر زندگی گذارے گا اور آخرت میں ناکام و نامراد ہوگا۔

(بقیہ صفحہ ۴۴ پر)

ترجمانی: ابوجاوید

حضرت ابوسفیان بن حارث رضی اللہ عنہ

تحریر: عبدالرحمان رافت پاشا

دو شخصوں کے درمیان شاید ہی کبھی ایسے گہرے اور مضبوط تعلقات قائم ہوئے ہوں گے، جیسے حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوسفیان بن حارثؓ کے درمیان تھے۔

ابوسفیان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عمر اور ان کے ہم جولی تھے، دونوں ایک زمانے میں پیدا ہوئے، اور ایک ہی خاندان میں ان کی نشوونما ہوئی۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی عم زاد تھے۔ ان کے والد حارث اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبداللہ ایک ہی صاحب، عبدالمطلب سے تھے۔ مزید براں یہ کہ وہ آپؐ کے رضاعی بھائی بھی تھے۔ سیدہ حلیمہ سعدیہؓ نے ان دونوں کو ایک ہی وقت میں دودھ پلایا تھا۔ ان تعلقات کے علاوہ وہ نبوت سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت گہرے دوست تھے اور جسمانی طور پر آپؐ سے غیر معمولی مشابہت رکھتے تھے۔

انھیں تمام وجوہ و اسباب کی بنا پر ابوسفیان کی ذات سے اس بات کی توقع کی جاتی تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہنے میں پہل کریں گے، اور آپؐ کی پیروی میں سب پر سبقت لے جائیں گے۔ لیکن اس توقع کے علی الرغم معاملہ بالکل برعکس سامنے آیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسے ہی کارِ دعوت کا آغاز فرمایا، اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرانا شروع کیا، اچانک ابوسفیان کے سینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف غیظ و غضب اور بغض و عداوت کی آگ بھڑک اٹھی اور ان کی دوستی دشمنی میں، صلہ رحمی قطع رحمی میں اور بھائی چارہ گی نفرت و اعراض میں

بدل گئی۔

ابوسفیان بن حارث کا شمار اس وقت قریش کے مشہور شہسواروں اور اسکے اونچے درجے کے شعراء میں ہوتا تھا۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور ان کی دعوت کی مزاحمت میں اپنی تلوار اور زبان دونوں کا بھرپور استعمال کیا۔ اور اسلام کو نقصان پہونچانے اور مسلمانوں کی اذیت رسانی اور انھیں بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے میں انھوں نے کوئی کسر نہ چھوڑی۔

قریش نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جتنی بھی جنگیں لڑیں، ان سب جنگوں کی آگ بھڑکانے والے یہی ابوسفیان تھے۔ اور مسلمانوں کو جتنی بھی اذیتیں اور تکلیفیں جھیلنی پڑیں ان سب میں ان کا زبردست ہاتھ تھا۔ اس شخص نے اپنی شاعری کے شیطان کو بیدار کیا اور اپنی زبان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں بے لگام چھوڑ دیا۔ اور آپؐ کی ذاتِ مبارک میں انتہائی دریدہ دہنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہایت گھٹیا، فحش اور دل آزار قسم کے اشعار کہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی دشمنی کا زمانہ بیس سال کی طویل مدت تک پھیلتا چلا گیا۔ اس دوران میں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں، ریشہ دوانیوں اور ایذا رسانیوں کے تمام مکروہ حربے استعمال کر ڈالے اور انھیں صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

ابوسفیان بن حارث فتح مکہ سے کچھ دنوں پہلے نعمتِ ایمان سے سرفراز ہوئے۔ ان کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی تفصیلات کتب سیرت میں محفوظ ہیں، اور تاریخ کے صفحات نے انھیں ہم تک منتقل کیا ہے۔ وہ تفصیلات انھیں کے الفاظ میں کچھ اسطرح ہیں:

"اسلام کا معاملہ جب پورے طور پر مستحکم ہوگیا، اسے بڑی حد تک قرار و ثبات حاصل ہوگیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ آپؐ مکہ کو فتح کرنے کے لئے تشریف لا رہے ہیں تو زمین اپنی وسعت و کشادگی کے باوجود میرے لئے تنگ ہو گئی۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اب میں کہاں جاؤں، کس کی صحبت اختیار کروں اور کس کے ساتھ رہوں؟ پھر میں

اپنے اہل وعیال کے پاس آیا اور ان سے کہا۔

"تم لوگ مکہ سے نکل چلنے کے لئے تیار ہو جاؤ کیونکہ محمدؐ بہت جلد یہاں پہنچنے والے ہیں۔ اور اگر مسلمانوں نے مجھے پکڑ لیا تو یقیناً میں قتل کر دیا جاؤں گا۔"

"کیا آپ کے لئے ابھی وقت نہیں آیا کہ آپ اس بات پر غور کریں کہ تقریباً پورا عرب محمدؐ کے آگے سرفگندہ، ان کے دائرہ اطاعت میں داخل اور ان کے دین کا حلقہ بگوش ہو چکا ہے، اور آپ ابھی تک ان کی عداوت پر مُصر ہیں۔ حالانکہ آپ ان کی نصرت و تائید کے سب سے زیادہ مستحق تھے۔" انھوں نے کہا۔

اور برابر مجھے محمدؐ کے دین کی طرف مائل کرتے رہے اور مسلسل مجھے اسکی طرف رغبت دلاتے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سینے کو قبول اسلام کے لئے کھول دیا۔ میں نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا اور اٹھ کر اپنے غلام "مذکور" سے کہا۔

"ہماری سواریاں سفر کے لئے تیار کر دو۔"

پھر اپنے بیٹے جعفر کو ساتھ لیا اور ہم دونوں تیز رفتاری سے ساتھ "ابواء"[1] کی طرف چل پڑے۔ مجھے یہ خبر ملی تھی کہ محمدؐ وہاں فروکش ہیں۔

جب مقام ابواء کے قریب پہنچا تو میں نے اپنا حلیہ تبدیل کر لیا تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہونے سے پہلے ہی کوئی مجھے پہچان کر قتل کر دے۔ میں ایک میل تک پیدل چلتا رہا۔ مسلمانوں کے دستے یکے بعد دیگرے مکہ کی سمت بڑھتے رہے اور میں ان کے راستے سے ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اصحاب محمدؐ میں سے کوئی مجھے دیکھ کر پہچان نہ لے۔

میں اسی حالت میں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دستے کے ساتھ نمودار ہوئے۔ میں نے آپؐ کی طرف رخ کیا اور جا کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ آپ نے مجھے نظر بھر کر دیکھا اور مجھے پہچانتے ہی اپنا چہرہ دوسری جانب پھیر لیا۔ میں گھوم کر سامنے آ کھڑا ہوا۔ آپ نے پھر مجھ سے اعراض کیا اور میری طرف سے رُخ پھیر لیا۔ میں پھر سامنے آ گیا۔ جب میں آپ کے سامنے آتا آپ اپنا رخ دوسری طرف کر لیتے۔

جب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے ارادے سے چلا تھا تو اس وقت مجھے اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے قبول

[1] مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ ہے۔

اسلام سے خوش ہوں گے۔ اور آپؐ کی خوشی آپ کے اصحابؓ کے لئے باعث فرحت و انبساط ہو گی۔ لیکن جب مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعراض کو دیکھا تو ان کے چہروں پر بھی نفرت و بے زاری کے آثار ظاہر ہو گئے۔ ان کی پیشانیاں شکن آلود ہو گئیں اور میں نے ان کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت و حقارت کے شعلے رقص کرتے دیکھے۔

میں ابوبکرؓ سے ملا تو انھوں نے بھی میری طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ میں نے عمر بن خطابؓ کو ایسی تسلی طلب نظر سے دیکھا جو ان کے دل میں نرمی اور ہمدردی کے جذبات بیدار کر دے۔ مگر ان کی نگاہوں میں بھی میرے لئے غصہ، نفرت اور غیظ و غضب کے سوا کچھ نہ تھا۔ بلکہ انھوں نے تو یہاں تک کیا کہ ایک انصاری کو میرے خلاف اکسا دیا۔ اور اس نے مجھ سے کہہ کر "او دشمن خدا! تو ہی وہ شخص ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کو ایذا پہنچاتا تھا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں حد سے تجاوز ہو گیا تھا؟" وہ انصاری برابر مجھے لعنت ملامت کرتا اور مسلسل میرے اوپر چیختا چلاتا رہا۔

دوسرے مسلمان بھی مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھتے اور میری پریشانی سے خوش ہو رہے تھے۔ اس وقت اچانک میری نظر اپنے چچا حضرت عباسؓ پر پڑی۔ میں ان کے پاس پہنچا اور بولا۔ "چچا جان! خاندان میں اپنے مقام و مرتبہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے قریبی رشتے کی بنا پر میں سمجھتا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے قبول اسلام سے خوش ہوں گے۔ لیکن ان کا جو رویہ سامنے آیا ہے، آپ جانتے ہیں۔ تو اب آپ میرے متعلق ان سے بات کر کے انھیں مجھ سے راضی کر دیجئے؟"

مگر انھوں نے کہا کہ۔

"نہیں! خدا کی قسم میں تمہارے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعراض کو دیکھ چکا ہوں۔ ایسی حالت میں تمہارے متعلق میں ان سے کوئی بات نہیں کر سکتا۔ میں ان کا احترام کرتا ہوں اور ان سے ڈرتا ہوں۔ البتہ آئندہ موقع و محل کی مناسبت سے کوئی بات کر سکتا ہوں۔"

میں نے کہا۔

"چچا جان! تو اس وقت آپ مجھے کس کے حوالے کر رہے ہیں؟"

انھوں نے جواب دیا۔

"جو کچھ تم مجھ سے سن چکے ہو، اس کے

علاوہ میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔"

ان کا یہ جواب سن کر میرے اوپر شدید حزن وملال کی کیفیت طاری ہوئی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد میں نے اپنے عم زاد علی بن ابی طالب رضؓ کو دیکھا۔ اور ان سے اپنے اس معاملے میں بات کی مگر انھوں نے بھی وہی کہا جو چچا عباس رضؓ نے کہی تھی۔ تب میں پھر چچا عباس رضؓ کے پاس واپس آیا اور ان سے کہا۔

"چچا جان! اگر آپ رسول اللہ علیہ وسلم سے سفارش کر کے میرے لیے ان کے دل میں کوئی جگہ نہیں بنا سکتے تو کم از کم مجھے اس شخص سے بچا لیجئے جو برابر مجھے برا بھلا کہہ رہا ہے اور دوسروں کو بھی اس پر اکسا رہا ہے۔"

"کون ہے وہ؟ ذرا اس کا حلیہ تو بیان کرو۔" انھوں نے پوچھا۔

جب میں نے اس کا حلیہ بیان کیا تو انھوں نے کہا کہ "وہ نعیمان بن حارث بخاری ہیں۔" پھر ایک شخص کو بھیجکر انھیں بلوایا اور ان سے کہا۔

"نعیمان! ابو سفیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عم زاد اور میرا بھتیجہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ آج اس سے خفا ہیں لیکن عنقریب آپؐ اس سے راضی ہو جائیں گے۔ اس لیئے بہتر ہے کہ تم اسکو ستانے سے باز آجاؤ۔" اور برابر ان سے اصرار کرتے رہے حتی کہ وہ اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ سب و شتم سے باز آجائیں گے اور کہا کہ اب میں ان سے کوئی تعرض نہیں کرونگا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جحفہ[1] میں نزول فرمایا تو میں آپ کی قیام گاہ کے دروازے پر جا بیٹھا، اور اپنے لڑکے جعفر کو اپنے پاس کھڑا کر لیا۔ خیمے سے نکلتے ہوئے جب آپؐ کی نگاہیں میرے اوپر پڑیں تو آپؐ نے میری طرف سے نظریں پھیر لیں۔ لیکن پھر بھی میں آپؐ کی رضامندی سے ناامید نہیں ہوا۔ میں نے اپنا معمول بنا لیا کہ جب بھی کسی منزل پر آپ کا قیام ہوتا، میں آپ کے دروازے پر جا کر بیٹھ جاتا اور اپنے لڑکے جعفر کو اپنے پاس کھڑا کر لیتا۔ لیکن آپؐ جب بھی مجھے دیکھتے منہ پھیر لیتے۔

میں کافی دنوں تک اس صبر آزما صورت حال سے دوچار رہا، آخر کار جب یہ پریشانی میرے لیئے ناقابل برداشت ہو گئی تو ایک دن میں نے اپنی بیوی سے کہا۔

"خدا کی قسم اب میرے سامنے صرف دو ہی راستے باقی رہ گئے ہیں۔ یا تو رسول اللہ

---

[1] مدینہ اور مکہ کے درمیان ایک مقام جو مکہ سے چار منزل کے فاصلے پر واقع ہے۔

صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے راضی ہو جائیں، ورنہ میں اپنے اس لڑکے کو ساتھ لے کر نکل جاؤں گا اور زمین میں حیران و سرگرداں پھرتا رہوں گا۔ حتی کہ ہم دونوں بھوک پیاس سے مر جائیں۔"

جب یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو وہ کچھ نرم پڑے اور ان کے دل میں میرے لئے ہمدردی اور رحمت و شفقت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ اور جب خیمہ سے باہر تشریف لائے تو پہلی بار میری طرف محبت آمیز نظر سے دیکھا اور میں نہال ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ لب مبارک کی بندکلی اب کھل اٹھے گی۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے، میں بھی آپ کا ہم رکاب تھا۔ آپؐ مسجد حرام کی طرف روانہ ہوئے میں دوڑتا ہوا آپؐ کے آگے آگے چل رہا تھا۔ غرضیکہ میں کسی حال میں بھی آپؐ سے جدا نہ ہوتا۔

حنین کی وادی میں ہوازن نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کرنے کے لیئے زبردست جمعیت اکٹھا کی اور غیر معمولی تیاریوں اور بے پناہ جوش کے ساتھ آپؐ کے مد مقابل ہوئے۔ انھوں نے اسلام اور مسلمانوں پر آخری اور فیصلہ کن ضرب لگانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیئے صحابہ رضؓ کا لشکر لے کر روانہ ہوئے تو میں بھی آپؐ کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اور جب میں نے مشرکین کے اس زبردست اجتماع کو دیکھا تو اپنے دل میں کہا۔

"خدا کی قسم آج میں ان تمام محرومیوں اور کوتاہیوں کی تلافی کر دونگا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے نتیجے میں مجھ سے سرزد ہوئی ہیں۔ آج میں ایسی جرأت و شجاعت کا مظاہرہ کرونگا جو میرے تمام پچھلے گناہوں کا کفارہ بن جائے گی۔ اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے راضی ہو جائیں گے۔"

جب دونوں فوجوں میں مڈبھیڑ ہوئی اور مشرکین کا دباؤ مسلمانوں پر بڑھنے لگا تو ان کے اندر کمزوری اور بزدلی کو راہ مل گئی۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد سے منتشر ہو گئے اور راہ فرار اختیار کی اور قریب تھا کہ ہم ہزیمت سے دوچار ہو جائیں۔

اس کٹھن گھڑی میں رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی شجاعت و دلیری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ آپ میدان جنگ کے بیچوں بیچ اپنے خچر پر سوار، مضبوط چٹان کی طرح ڈٹے ہوئے تھے۔ اور ایک بپھرے ہوئے شیر کی مانند شمشیر بکف اپنی اور اپنے آس پاس کے لوگوں کی طرف سے مدافعت کر رہے تھے۔ اس وقت میں اپنے گھوڑے سے کود پڑا اور اپنی تلوار کی نیام توڑ کر پھینک دی ـــــ خدا جانتا ہے کہ اس وقت میرا ارادہ یہی تھا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدافعت میں لڑتا ہوا آپؐ کے سامنے ہی شہید ہو جاؤں ـــــ میرے چچا حضرت عباسؓ آپؐ کے خچر کی لگام تھامے ایک جانب کھڑے تھے۔ میں نے دوسری سمت اپنی جگہ سنبھالی۔ میرا دایاں ہاتھ تلوار کے قبضے پر تھا اور بائیں ہاتھ سے حضورؐ کی رکاب تھامے دشمنوں کو آپ سے دور ہٹا رہا تھا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس طرح بے جگری کے ساتھ لڑتے ہوئے دیکھا تو بڑے تحسین آمیز انداز میں چچا عباسؓ سے پوچھا۔

"یہ کون ہے جو اس طرح داد شجاعت دے رہا ہے؟"

"یہ آپ کا بھائی، آپ کا عم زاد ابوسفیان بن حارث ہے۔ اے اللہ کے رسول! آپ اس سے راضی ہو جائیں" چچا نے جواب دیا۔

"میں اس سے راضی ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس کی اس ساری عداوت کو معاف فرمائے جو اس نے اب تک میرے ساتھ کی ہے" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے راضی ہو گئے۔ اس سے مجھے بے پناہ مسرت حاصل ہوئی اور میرا دل خوشی کے مارے بلیوں اچھلنے لگا۔ میں نے رکاب ہی میں آپؐ کے قدم مبارک کو بوسہ دیا۔ پھر آپ نے میری طرف ملتفت ہوتے ہوئے فرمایا۔

"میرے بھائی! آگے بڑھو اور دشمن پر ٹوٹ پڑو۔"

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اپنے لئے یہ کلمات سن کر میرے اندر شجاعت و دلیری کے شعلے بھڑک اٹھے اور میں نے مشرکین پر ایسا زوردار حملہ کیا کہ ان کے قدم ڈگمگا گئے اور وہ اپنی جگہ سے ہٹ گئے۔ اس حملے میں بہت سے مسلمان بھی میرے ساتھ شریک ہو گئے۔ ہم ان کو تقریباً ایک میل تک کھدیڑتے چلے گئے۔ اور وہ مختلف اطراف میں بھاگ نکلے۔"

حضرت ابوسفیان بن حارثؓ کو غزوۂ حنین کے موقع پر نبی کریمؐ کی رضامندی کی نعمت حاصل ہو گئی اور وہ آپؐ کی صحبت کی سعادت سے بھی سرفراز ہو گئے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے سابقہ رویے کی وجہ سے ان کو ایسی شرمندگی و پشیمانی دامن گیر ہوئی کہ وہ زندگی بھر آپؐ کے چہرے کی طرف کبھی نظر نہ اٹھا سکے، نہ کبھی آپؐ سے آنکھیں چار کر سکے۔ حضرت ابوسفیانؓ اپنی زندگی کے ان تاریک ایام پر بے حد ندامت و خجالت محسوس کرتے جو دورِ جاہلیت کی نذر ہو گئے، جن میں نورِ خداوندی اور کتابِ الٰہی سے محروم رہے۔ لیکن اب وہ شب و روز قرآن کریم پر جھکے رہتے، اس کی آیات کی تلاوت اور اس کے احکام پر غور و فکر میں مشغول رہتے اور اس کی نصیحتوں سے بھرپور استفادہ کی کوشش کرتے۔

انھوں نے دنیا اور اس کے عیش و آرام سے یکسر کنارہ کشی اختیار کر لی اور اپنے تمام اعضاء و جوارح کے ساتھ خدائے تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ ایک روز جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں مسجد میں داخل ہوتے دیکھا تو حضرت عائشہ صدیقہؓ سے فرمایا۔

"عائشہؓ! جانتی ہو یہ کون ہے؟"

حضرت عائشہؓ نے کہا

"نہیں، اے اللہ کے رسولؐ!"

"یہ میرے عم زاد ابوسفیان بن حارثؓ ہیں۔ دیکھو! یہ سب سے پہلے مسجد میں آتے ہیں۔ اور سب سے آخر میں اس سے نکلتے ہیں۔ اور جب تک اس میں رہتے ہیں، نماز میں مشغول رہتے ہیں" آپؐ نے فرمایا۔

اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، اور وہ اپنے رب سے جا ملے تو حضرت ابوسفیانؓ شدید صدمہ اور رنج و الم سے دوچار ہوئے۔ ایسے صدمے سے جو کسی ماں کو اپنے اکلوتے فرزند کی وفات پر بھی نہیں ہوتا۔ وہ آپؐ کی جدائی کے غم میں اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے جس طرح کوئی شخص اپنے محبوب کی جدائی پر بھی نہیں روتا۔ اور آپؐ کی یاد میں ایسا شاہکار اور درد انگیز مرثیہ کہا جو ان کے سوز محبت اور عشق اور اندرونی کرب و الم کا آئینہ دار ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کے زمانۂ خلافت میں انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ اب ان کی موت کا وقت قریب آ گیا ہے تو انھوں نے اپنے ہاتھوں اپنے لئے قبر کھودی۔ اور اس پر ابھی تین دن بھی نہیں گذرے تھے کہ ان کا آخری وقت آ پہنچا جیسے موت کے ساتھ

بقیہ صفحہ ۴۲ پر

اقبال کا ایک پیکر
موجِ دریا

توقیر احمد خاں
۳۴- بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

سکوت، تعطل، و بے عملی کے خلاف

جب اقبال کا جنگی اعلان "اسرارِ خودی" شائع ہوا تو اس کا ترجمہ انگلستان میں بھی کیا گیا اور وہاں پر بڑا مقبول ہوا۔ انگلش رسالہ "دی نیو ایج" کے تبصرہ نگار نے اقبال کے ان افکار کو جو جمود و تعطل سے بیزاری اور پیہم جد و جہد کا پیغام تھے جرمن کے مشہور مفکر "نطشے" کا ہم خیال قرار دیا اور اقبال کے فلسفہ عمل پر نطشے کا اثر ثابت کرنے کی کوشش کی جس پر اقبال کو تشویش ہوئی اور انھوں نے مسٹر نکلسن کے نام اس کی تردید میں خطوط لکھے جس سے معلوم ہوا کہ اقبال کا ذہنی رجحان اور ارتقاء مغرب کی بجائے کسی اور مرکز کی طرف ہے۔ اقبال کے فکر و فلسفے کے مطابق زندگی جہدِ مسلسل ہے، "لذتِ پرواز" ہے اور اس کے لئے "برگ و ساز" ہے۔ الجھ کر سلجھنے میں اسے "لذت" اور "تڑپنے پھڑکنے میں راحت" میسر ہوتی ہے۔ سخت کوشی سے "تلخِ زندگانی انگبیں" بن جاتا ہے۔

اقبال کے پیغامات میں ان کا فلسفۂ حرکت و عمل ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کی نظروں میں شرق و مغرب کے تمام علوم تھے، انھوں نے مشرق و مغرب کے فلسفہ پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر ناقدین اقبال اقبال کا رشتہ مغرب سے جوڑ دیتے ہیں۔ اقبال کے حرکت و عمل کے اس فلسفہ کو بھی مغرب کی دین سمجھا گیا۔ محققین اپنی کاوشوں سے نئے نئے پتے کی باتیں سامنے لاتے رہتے ہیں اور تلاش و جستجو کے رشتے قدیم و جدید سے قائم کئے جاتے رہتے ہیں۔ اقبال کی مماثلت بھی متعدد باتوں میں حکمائے قدیم سے قائم کرتے رہتے ہیں۔ سکون و حرکت کے اسی مسئلہ پر تجزیہ کرتے

ہوئے ممتاز حسین صاحب نے لکھا ہے کہ:

"سکون و حرکت کے فلسفیانہ مسئلے کے بارے میں اقبال زینو کے بجائے ہرقلیطوس کے ہم نوا ہیں اور ان کے اشعار کہیں کہیں تو خود ہرقلیطوس کے اقوال معلوم ہوتے ہیں"

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

ہر شے مسافر ہر چیز راہی
کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی

بانگِ درا کی نظم "چاند اور تارے" میں ان کا نقطۂ نظر اور بھی واضح ہے۔

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
اس راہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

کلامِ اقبال میں جد و جہد اور حرکت عمل کا طوفان خیز تذکرہ جگہ جگہ پایا جاتا ہے۔ بانگِ درا میں حرکی پیغام کا بہترین نظم "خضرِ راہ" میں اقبال کا شعر ملاحظہ ہو۔

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

اس سے بڑھ کر "عمل" کی شان میں اور کیا بات ہوگی کہ جس سے زندگی کو نام بخشا اور دوامی ہو جائے۔ اقبال اس پیغام کی وضاحت کے لئے کائنات عالم کی ایسی چیزوں کا انتخاب کرتے ہیں جو متحرک اور چلتی پھرتی ہیں۔ اسی وجہ سے اقبال کے یہاں خضر، چاند، سورج، ستارے، جوئے کوہسار، آبِ رواں، پروانہ، جگنو، کرن، نوا، آرہ، بجلی، بادِ نسیم، اور موج وغیرہ کے پیکر علامتی انداز سے استعمال ہوتے ہیں۔ یہ تمام پیکر حرکی ہیں۔ اقبال انکو پیش کر کے اپنے پیغام حرکت و عمل کو پہنچانا چاہتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ کائنات عالم کی مختلف اشیاء حرکت میں ہیں حرکت ہی سے بقائے دوام ہے اور جمود اور سکوت زندگی سے فرار ہی نہیں بلکہ خاتمہ زندگی کا پیام ہے جو زندگی کے مزاج کے منافی ہے۔ زندگی تو موج کی روانی کی طرح "پیہم رواں" "ہر دم جواں" اور مزید بر آں جاوداں ہے۔ موج کے تصور سے اقبال کے ذہن میں بڑی بےچینی، ہلچل اور اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ حرکی اشیاء سے انھیں گہرا ذہنی رابطہ ہے اس لئے اقبال موج کو پسند کرتے

ہیں اور جا بجا موج کے پیکر سے اپنے خیالات کے ابلاغ کا کام لیتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ موج کی زندگی کا دارومدار ہی اضطراب اور بے قراری میں ہے۔ وہ جب تک حرکت میں رہتی ہے اپنا وجود قائم رکھتی ہے جب رک جاتی ہے تو اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔ گل پژمردہ کو دیکھ کر بھی اقبال کا ذہن حرکی پیکر تراشی کی طرف مائل ہوتا ہے اور وہ اس گل کو وہ دن یاد دلاتے ہیں جب اسکا گہوارہ جنباں موج صبا تھی۔

تھی کبھی موج صبا گہوارہ جنباں تیرا
نام تھا صحن گلستاں میں گل خنداں تیرا

اقبال کے مطابق موج سطوت دریا سے بھی زیادہ اہمیت رکھنے والی چیز ہے کیوں کہ سطوت دریا میں بقا و دوام نہیں بلکہ اس کا یہ عمل اپنی انفرادی کیفیت کی وجہ سے تسلسل کا حامل نہیں مگر موج کی تحریک ایک دائمی اور مسلسل شے ہے ہمیشہ دریا میں پیدا ہوتی رہتی ہے علاوہ ازیں موج در موج موجوں کے حلقوں سے ایک زنجیر سی بن جاتی ہے جسے دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ رفتار دریا کی گرفتاری کا عزم کئے ہوئے ہے۔ جو موج کی بلند حوصلگی تیزی طبع کا غماز ہے۔ موج کا پانی کے بہاؤ سے بلند ہو کر اپنی حیثیت و انفرادیت کا تحفظ کرنا اس کے ذوق نمو اور شوق طلب کا آئینہ دار ہے۔

تو نے دیکھا سطوت رفتار دریا کا عروج
موج مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ

موج کی بے تابی و بے قراری اس کی تڑپ کا باعث ہوتی ہے۔ اس کی ایک عبرت انگیز خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ مشکل مقامات پر بھی اپنا حوصلہ پست نہیں کرتی وہ کبھی کسی چیز سے ٹکرا کر رک نہیں جاتی اور نہ اپنا سفر ختم کر دیتی ہے بلکہ اپنا سفر پیہم جاری رکھتی ہے اور آنے والے شدائد راہ سے ٹکرا کر بھی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے بس ایک ہی عزم ایک ہی ارادہ اور ایک ہی دھن ہوتی ہے کہ منزل پر پہنچنا ہے۔ اسے منزل سے بے پناہ محبت ہے منزل کی جستجو اور شوق میں وہ اپنا سر ساحل سے جا جا کر پٹکتی ہے۔ دریا کی کو "تاہ دامانی" سے تنگ آکر وسعت بحر کی تلاش میں پریشاں نظر آتی ہے۔ موج کی یہ خوبیاں اقبال نے بانگ درا کی نظم موج دریا میں بیان کی ہیں۔

مضطرب رکھتا ہے میرا دل بیتاب مجھے

عین ہستی ہے تڑپ صورت سیماب مجھے
موج ہے نام مرا بحر ہے پایاب مجھے
ہو نہ زنجیر کبھی حلقۂ گرداب مجھے
آب میں مثل ہوا جاتا ہے توسن میرا
خار ماہی سے نہ اٹکا کبھی دامن میرا
میں اچھلتی ہوں کبھی جذب مہ کامل سے
جوش میں سر کو پٹکتی ہوں کبھی ساحل سے
ہوں وہ رہرو کہ محبت ہے مجھے منزل سے
کیوں تڑپتی ہوں یہ پوچھے کوئی میرے دل سے
زحمت تنگی داماں سے گریزاں ہوں میں
وسعت بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

مذکورہ اشعار میں موج کے پیکر کی خصوصیات کو واضح کرنے کے لئے اقبال نے اور بھی بہت سے ذیلی پیکر استعمال کئے ہیں "دل بے تاب" "سیماب" "حلقۂ گرداب" "توسن" "رہرو" وغیرہ مرئی اور متحرک پیکر تراشی کے باب سے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے لفظی پیکر مثلاً اچھلنا، سر کو پٹکنا، تڑپ وغیرہ تڑپتے پھڑکتے پیکر ہیں جو موج کی بے قراری اور پریشاں حالی کے غماز ہیں۔ موج کا یہ اضطراب، تڑپ اور یہ جستجو اور اولوالعزمی اقبال قوم میں بھی دیکھنا چاہتے ہیں وہ ملت کو اسی خیال سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں جو موج مضطر کو بے چین رکھتا ہے۔ شوق بے پایاں، جستجوئے فراق، پریشاں حالی، عزم بلند اور کوشش پیہم موج کے پیکر کی وہ خصوصیات ہیں جو اپنی خاموش عملی زبان سے انسان کو دعوت عمل کا پیغام دے رہی ہیں۔

اقبال کا یہ فلسفہ کسی مغربی مفکر یا حکیم کا رہین احسان نہیں بلکہ سرچشمہ علوم و معانی قرآن حکیم کی ڈائنامک تعلیمات کا نتیجہ ہے۔ جسے انھوں نے اسرار خودی تشکیل جدید الہیات اسلامیہ میں واضح کیا ہے کہ قرآن نے عمل پر بہت زور دیا ہے۔۔

جتنیہ: بہ جامعہ کے [illegible]

امام مسلم پہلے وضو کرتے تھے پھر کپڑے پہنتے تھے، نیت کرتے تھے اور اس تصور سے مسند درس پر بیٹھتے تھے کہ وہ حضور سے محو گفتگو ہیں اور ان کے کلام کو دوسروں تک منتقل کر رہے ہیں۔۔۔

ارشاد احمد مخدومی
ایس۔ ایس ہال علی گڑھ

آئینے کے سو ٹکڑے

(الف)

میں اپنے مطالعہ کی میز پر ایک آئینہ ضرور رکھتا ہوں، اسکا صحیح استعمال میرے نزدیک یہی ہے کہ میں اس کے ذریعہ اپنی حقیقت سے باخبر رہوں۔ خصوصاً صبح آئینہ ضرور دیکھتا ہوں کہ اس سے پورے دن میں کسی خوش فہمی کا شکار ہونے سے محفوظ رہتا ہوں میں کبھی آئینہ کو برا بھلا نہیں کہتا کیوں یہ تو ہمیشہ صداقت ہی پیش کرتا ہے اور حقیقت پسندی میرا آئین ہے

ان دنوں پورے ہندوستان کا اردو داں طبقہ اتر پردیش کے وزیر خوراک مسٹر واسدیو سنگھ کے خلاف نفرتوں کا زہر اگل رہا ہے، کہیں سے آواز آتی ہے کہ اسے کانگریس پارٹی سے نکالا جائے تو کسی کا مطالبہ ہے اسے فوراً وزارت سے معطل کیا جائے اور ایک رسالے کے مدیر صاحب نے تو بیچارے کے لئے آگرہ یا بریلی کا پاگل خانہ تجویز کر دیا کہ واسدیو سنگھ کو دماغی عارضہ لاحق ہے!

بیچارہ آئینے کا یہ اک ٹکڑہ کس قدر مظلوم ہے کہ اس نے تو سچی تصویر دکھائی اور لوگ اسکے پیچھے پڑ گئے کیا قصور ہے اس کا یہی نا کہ اس نے پوری برسر اقتدار پارٹی کا اصل چہرہ ہمیں دکھا دیا۔ ارے بھئی اردو والو یہ واسدیو سنگھ زرا زیادہ ہی شفاف آئینہ ہیں میرا خیال ہے کہ انہیں غلط سے امپورٹ کیا گیا ہے شاید آپ بھی متفق ہوں کہ فارن کا مال صاف ستھرا ہوتا ہے، دیکھئے اگر آپ تھوڑا سا نگاہ کو جما کے غور سے کانگریسی آئینے دیکھیں تو آپ کو یہی تصویر وہاں بھی دیکھنے کو مل جائے گی۔ تو پلیز آپ اس آئینے کو گالی نہ دیں بلکہ اس میں ہندوستانی اردو داں طبقے کو کانگریس کی صحیح تصویر دیکھنے دیں!

(ب)

مسز گاندھی کے دردناک قتل کے فوراً بعد ہندوستان بھر میں ردعمل کے طور پر سکھوں

کو اس قتل و غارتگری اور لوٹ مار کا سامنا کرنا پڑا کہ الحفیظ۔ دلی جو ہندوستان کی راجدھانی ہے وہاں تو بیچارے کروڑوں میں کھیلنے والے سکھ راتوں رات بے گھر ہوگئے اور مال و متاع سے ہاتھ دھو بیٹھے کہ ملک کے نوجوان اور قابل وزیر اعظم سرگرم عمل ہوئے سردیوں کی راتوں میں اور یخ بستہ ہواؤں میں آپ نے دلی کا خود دورہ کیا متاثرہ علاقوں میں گئے حالات کا مشاہدہ کیا اور پھر دیکھتے دیکھتے فسادات پر قابو پالیا گیا سکھوں کی لوٹی ہوئی بیشتر اشیاء انہیں واپس دلائی گئیں۔ پورا ملک اس قابل اور بہترین منتظم وزیر اعظم کی صلاحیت پر داد واہ کرے گا۔

(دوسرا رخ)

ابھی تازہ ترین سرکاری اعداد و شمار کے مطابق گجرات میں جاری ہنگاموں میں اب تک ۲۲۷ انسانی جانیں ضائع ہو چکی ہیں جن میں ۹۰ افراد تو صرف پولیس اور فوج کی گولیوں کا شکار ہوئے۔

ہندوستانی انٹلی جنس کی تفتیش کے مطابق اینٹی ریزرویشن تحریک کو فرقہ وارانہ رنگ دینے میں گجرات کی کانگریسی حکومت نے اہم کردار ادا کیا۔ تاکہ وہ اس تحریک کا رخ موڑ کر اپنی کرسی کو محفوظ رکھ سکے۔

لوگ سوال کرتے ہیں کہ وزیر اعظم کی وہ صلاحیت کہاں گئی جو انھوں نے سکھوں کے معاملہ میں دکھائی تھی۔

ارے بھائی وزیر اعظم کی صلاحیتیں تو برقرار ہیں لیکن ہندوستان میں آبادی کا اضافہ تو خطرناک صورت اختیار کر چکا ہے بھلا ملک کا سچا بہی خواہ معاملے کے اس پہلو کو کیوں نظر انداز کر دے خصوصاً مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی تو ملک کے مستقبل کے لئے خطرہ بن گئی ہے نس بندی ہوتی ہے تو لوگ واویلا مچاتے ہیں اور حکومت کو گرانے کے درپے ہو جاتے ہیں تو خاندانی منصوبہ بندی کس طرح عمل میں آئے

آئینہ اس زاویے سے دیکھئے تو آپ بھی وزیر اعظم کی خداداد انتظامی صلاحیت کے معترف ہو جائیں گے!

ڈاکٹر محمد یوسف خاں
شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی
علیگڑھ

شعر الطبیعہ یا نیچرل شاعری

جب شاعر کسی حسن یا جمال کو دیکھتا ہے یا عجائبات پر نظر ڈالتا ہے تو اسکے جذبات اور فکر وخیال میں ایک تلاطم پیدا ہو جاتا ہے اس کی طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل ہوتی ہے اور بے ساختہ اسکے منھ سے اشعار نکلنے لگتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنے فکر وخیال کو الفاظ کی موتی میں پروتا چلا جاتا ہے اور اشعار کی مالائیں ڈھلنے لگتی ہیں۔ اس میں آورد بالکل ہی نہیں ہوتی بلکہ آمد ہی آمد ہوتی ہے۔ اس کو فطری شاعری یا شعر الطبیعہ کہتے ہیں۔

جدید ادب میں شعر الطبیعہ کو مختلف قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے مغربی شعراء کا کہنا ہے کہ شعر الطبیعہ کی مختلف قسمیں اور مختلف انواع ہیں۔ پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ شعر الطبیعہ کا اطلاق کس قسم کی شاعری پر ہوگا مغربی نقاد اور شعراء نے اسکو حرکت الابداعیہ سے تعبیر کیا ہے۔ حقیقت میں ابداعی شعراء نے شعر الطبیعہ کو اونچا اٹھانے کے لئے بے پناہ جدوجہد کی اور انھوں نے ہر موضوع پر اشعار کہے ہیں۔ جیسے خوشی غم، موت، حمد، ہجو، وصف۔ اور حسن وجمال۔ اور خوبصورت مناظر۔ مثلاً پھولوں کی جگہ اور باغات کی خوبصورتی پر انھوں نے اشعار کہے ہیں مگر اس کام کی طرف وہ شعراء مائل ہوئے ہیں جو طبعاً عاشق مزاج تھے۔

فطری شاعری ہر دور کا خاصہ رہی ہے اور ہر زمانے میں پائی گئی ہے زمانہ جاہلیت میں بھی اسکا وجود ملتا ہے اس لئے اسکا کسی دور سے خاص کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

عربی ادب میں فطری شاعری

زمانہ جاہلیت کے عربی ادب پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو

وہاں فطری شاعری اپنے فطری انداز میں نظر آتی ہے قدیم عربی جاہلی شعراء نے جا بجا اپنے کلام میں چشموں کا ذکر محبوب کے روانہ ہونے کا وقت اور باقی ماندہ آثار و کھنڈرات کا بیان اونٹ اور گھوڑے کے اوصاف صحرا کی خشکی کا اسطرح تذکرہ کیا ہے کہ دل کھنچ جاتا ہے اور ذرا بھی تصنع اور بناوٹ معلوم نہیں ہوتی۔ انھوں نے بدویانہ زندگی کی پوری تصویر کشی اسی انداز سے کی ہے اور اس دور میں شعر الطبیعہ کا عروج اسی طریقہ سے رہا۔

عرب میں شعر الطبیعہ کا وہی ڈھانچہ تھا جو غربیوں کے یہاں تھا۔ عربیوں اور غربیوں نے شعر طبعی کی دو قسمیں کی ہیں۔ (۱) "شعر الطبیعہ حیہ" (۲) "شعر الطبیعۃ صامتہ" شعر الطبیعۃ حیہ سے وہ اشعار مراد لیتے ہیں جنمیں انسان کو چھوڑ کر جانوروں کا ذکر کیا گیا ہو۔ (۱) "شعر الطبیعۃ صامتہ" سے مراد وہ اشعار ہیں جنمیں قدرتی چیزوں جیسے سمندر۔ باغات اور باغیچوں کا ذکر کیا گیا ہو بعض نقادوں کی اس تقسیم کو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن شعر طبعی کی یہ تعریف ناقص معلوم ہوتی ہے کہ شعر طبعی وہ ہے جو طبیعت کی عکاسی کرے۔ اور طبیعت پرواز فکر میں شاعر اپنے خیالات والفاظ سے حسن پیدا کرے

درحقیقت شعر طبعی وہی ہے جو قلب شاعر پر نازل ہونے والے جذبات اور احساسات کو ظاہر کرے۔

بنیادی فرق

جاہلی شاعری میں بکثرت طبعی شاعری کے نمونے ملتے ہیں جیسے امرالقیس نے اپنی محبوبہ کے لئے بالکل نئی نئی تشبیہات ایجاد کیں۔ اس نے محبوبہ کی آنکھ کو راہب کے چراغ سے تشبیہ دی۔ اور ہاتھوں کو برق سے اسمیں فرق صرف اتنا ہے کہ اس وقت اس صنف کا نام ایسی شاعری کو نہیں دیا گیا تھا مگر بعد میں اسنے مستقل فن کی شکل اختیار کر لی۔

کچھ عرصہ بعد جب عرب بدوی زندگی سے شہری زندگی میں آئے تو کھنڈرات وغیرہ کے ذکر کی جگہ محلات اور باغات کے ذکر نے لے لی۔ اور اس زمانہ میں شعراء کا انداز فکر شہریت کے ڈھانچے میں بدل گیا اور بدوی رنگ و ڈھنگ ختم ہو گیا اشعار افکار کے شاداب گلستاں نظر آنے لگے۔

عباسی دور اسکے ارتقاء کا سنہرا دور

کہلاتا ہے۔ ابو تمام بحتری۔ ابن الرومی وغیرہ نے حیات بخش اور طبعی اشعار لکھے ہیں۔

شعر الطبیعۃ فی الاندلس

اندلس میں شعر الطبیعۃ کی ارتقاء کا سب سے بڑا اور اہم سبب یہ ہے کہ یہاں خوبصورت اور دل کو لبھانے والے مناظر صحت بخش آب و ہوا۔ دلکش اور پرفضا مقامات موجود تھے اسی طریقہ سے نہروں باغوں اور اسکی شادابی کے لحاظ سے یہ خطہ جنت الفردوس کے ٹکڑے کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ یہاں کی آب و ہوا اور اندلس کے حسن و جمال نے قدرتی طور پر یہاں کے لوگوں کو متاثر کیا تھا بس اب اندلس کے شعراء نے ان خوبصورت حسین و جمیل مناظر کو دیکھکر اپنی نظموں میں ڈھالنا شروع کر دیا اس جگہ شاعر کا شعر پیش ہے

یا اهل اندلس للّٰه درکم
ماءٌ وظلٌّ وانهارٌ واشجارُ
ما جنة الخلد الا فی دیارکم
ولو تخیرت هذا کنت اختار

بہرحال اسپین کے قدرتی حسن و جمال نے صرف شعراء کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ اندلس کے عام لوگ بھی اس سے متاثر ہوئے۔ بہت سے شعراء نے عام لوگوں کے جذبات کو ابھارا تھا۔ جسمیں ابن ہانی، ابن زیدون اور ابن خفاجہ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اور ان شعراء کے اشعار نے لوگوں کے خیالات کو بلند درجہ تک پہونچایا۔

اب یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ایسی کیا خصوصیت ہے کہ اندلس کے شعراء کو امتیاز حاصل ہے۔ اسکی مختلف وجوہات پیش کی جا سکتی ہیں۔

(۱) اندلس کے شعراء نے شعر الطبیعی کی تعریف کو حسن کے ذکر کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے۔

(۲) انھوں نے ایسے شعر لکھے ہیں کہ جیسے اندلس کے باغات نہروں پہاڑوں کی تصویر کھینچ گئی۔

(۳) اندلس کے شعراء نے مختلف شہروں کے ذکر کو اور انکی تعریف کو مختلف انداز میں اور مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ جیسے ابن زیدون نے قرطبہ اور اسکی شادابی کے ذکر کو اور اسکی خوبصورتی کو اپنی شاعری کا ایک اہم حصہ قرار دیا ہے۔ ابن سفر المرینی اشبیلیہ اور ابوالحسن ابن جدار نے وادی اشات کا ذکر اس قدر انوکھے انداز میں کیا

ہے کہ اسکی توصیف اور حمد کو اسنے اپنا فرض بنالیا۔

(۴) محبوبہ کے حسن و جمال اور اسکی زلفوں کے گھنے سایہ کو خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ اور اسکو باغ جنت اور شمس سے تشبیہ دی ہے۔

(۵) اندلس کے شعراء نے کچھ ایسے اشعار طبعی لکھے جو خوشی و آسودگی کا اظہار کرتے ہیں۔ ابن زیدون کے اشعار بکثرت ایسے ہی ملیں گے اسکا مشہور و معروف قصیدہ جسکا مصرع ہے۔

انی ذکرتک بالزھراء مشتاقاً

(۶) اندلس کے شعراء کے یہاں غزلیہ انداز نمایاں ہے اور یہاں کی آب و ہوا نے غزلیہ لہو و غنا کا ماحول بنا دیا تھا۔ اندلس کی شاعری میں یہ وصف نمایاں نظر آتا ہے اور اسی ماحول نے اندلس میں شاعری کی ایک نئی قسم موشحہ کا اضافہ کیا۔

ابن زیدون کہتا ہے

روحی اندلس روح حلیۃ الیق مورق الاناب
واصا ثعلبة عالم وغرلیق من آتی الاحسان

یہی اسباب ہیں جنکی وجہ سے اندلس کی شاعری اپنا انوکھا انداز اور ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

اندلس کی شاعری کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

(۱) اموی دور کی ابتداء سے پانچویں صدی کے شروع تک۔ یہ دور تقلیدی دور کہلاتا ہے عموماً یہاں کے شعراء عباسی دور کے شعراء کی نقالی کرتے ہیں۔ ابن عبدربہ، ابن ہانی، ابن قسطلانی کے اشعار اسکی کھلی دلیل ہیں۔

دوسرا دور چوتھی صدی کے خاتمہ سے پانچویں صدی کے نصف تک اس دور میں تقلید کے ساتھ ساتھ کچھ الگ اور انوکھے انداز کے شعر بھی ملتے ہیں۔ موشحات اسی دور کی پیداوار ہے۔ ابن زیدون اور ابن عمار وغیرہ اس دور کے مشہور شعراء میں سے ہیں۔

تیسرا دور پانچویں صدی کے نصف سے چھٹی صدی تک اس دور میں نئے انداز کے شعر ملتے ہیں۔ ابن حمدیس، ابن خفاجہ، ابن عبدون لسان الدین ابن خطیب کے اشعار کشیدہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔

"ابن خاجہ کہتا ہے"

بعیشک حسن تدری اصوح الجنائب
تجیب برحلی ام مشہور النجائب

اندلس کی شاعری کی خصوصیات

اسمیں سہل الفاظ اور سادہ تراکیب اور طبیعت کی سادگی تو شں اخلاقی۔ اندلس کا علمی جمال اور خوبصورتی ہوتی ہے۔

معانی صاف اور واضح ہوتے ہیں۔ فلسفیانہ تعمق اور اسرار کی باریک بینی نہیں ہوتی ہے کیونکہ انکو علوم فلسفہ سے رغبت نہیں تھی۔ اور عوام ان علوم سے نفرت کرتے ہیں اور شعراء اپنی سادہ طبیعتوں کے ذریعہ اور خیال آرائی کی مدد سے جزئی معنی کو اسطرح بیان کرتے ہیں کہ بظاہر معنی جدید اور اشعار نئے معلوم ہوتے ہیں۔

اندلسی شعراء میں تخیل غالب ہے۔ جسکی وجہ سے متنوع حسن وجمال کی زیادتی ہے۔ اسی لئے شاعری میں زیادہ تشبیہات بھی تخییلات اور اچھوتے خیالات بہت زیادہ ہیں۔

اغراض شاعری | مدح۔ ہجو۔ رثا۔ فخر۔ حماسہ۔ تہنیت۔ وصف۔

غزل، ساقی، مشاہد، لہولعب، زہد۔ اور تصوف۔ اندلسی شعراء زہد و حکمت اور فلسفیانہ شاعری سے قاصر ہیں۔ مگر فطری مناظر کی شاعری میں آگے آگے رہے ہیں۔

اندلسی باغات، درختوں، پھولوں اور پھلوں، پرندوں، ابر، رات، برق، باراں و قوس، تالابوں، نہروں اور جھیلوں وغیرہ کو اندلسی شعراء نے اپنے قصائد میں بہت زیادہ نظم کیا ہے۔

جنگی لشکروں۔ سمندروں کے احوال۔ معرکہ آرائیاں، محل، فواروں۔ لہولعب کے آلات۔ مجلسوں اور داستان گوئی وغیرہ کا وصف بیان کیا گیا ہے۔ اہل اندلس نے مندرجہ ذیل جدید اقسام کی شاعری کی ہیں۔

زوال پزیر حکومتوں کی براتی۔ مثلاً صالح بن شریف متوفی ۶۹۵ھ کا مرثیہ۔ نبی اور کبار علماء سے استعانت و فریادرسی علاوہ ازیں مسلم بادشاہوں کو غیر مسلموں کے قبضہ سے حکومت حاصل کرنے کی ترغیب، آٹھویں اور نویں صدی ایسی شاعری سے بھری پڑی ہے۔

تحریر ماہر القادریؒ

مرسلہ: مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی

تاثرات جو پرانے نہیں ہوتے

حاضرین کی نظریں ڈائس پر لگی ہوئی تھیں ٹھیک وقت پر امیر جماعت اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ تشریف لائے، انہیں دیکھ کر نہ کوئی کھڑا ہوا اور نہ جماعت کے کسی کارکن نے زندہ باد کے نعرے لگائے تلاوت قرآن شریف کے بعد مولانا موصوف نے تقریر شروع کردی اتنا بڑا اجماع اور ہر مکتبہ فکر وخیال کے آدمی موجود، مگر پورا مجمع ساکت و متوجہ اب دل کے دھڑکنے کی بھی آواز نہیں ہے اور لطیفے ہیں۔ نہ شعر اور نہ کہاوتیں ہیں۔ مگر لوگ کس قدر دلچسپی اور خاموشی کے ساتھ انکی تقریر سن رہے ہیں سادہ جملے کو ترشی ہوئی قلعہ معلی کی زبان، باوقار لہجہ، کسی قسم کی ایکٹنگ نہیں، بس زیادہ سے زیادہ ہاتھ کو جنبش دیتے ہیں وہ بھی بڑی متانت کے ساتھ دلیلیں آتی زیادہ وزنی زوردار، مسکت اور مطمئن کرنے والی کہ بات دل میں اترتی جاتی ہے اور ہر سننے والا مخالف سوچنے اور غور کرنے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے

(چراغ راہ تحریک اسلامی نمبر ۱۹۶۳ء)

غزل

مولانا مودودیؒ کی آواز میں چھپنے

شفیق اعظمی، ایم اے

نہ جانے کیوں نشانِ غیرتِ انساں نہیں ملتا
غم جاناں تو ملتا ہے غم دوراں نہیں ملتا

بتا اے وحشتِ دل اب کہاں جائیں کدھر جائیں
مجھے ایسا درد پایا ہے کہیں درماں نہیں ملتا

شراب تو لٹی ہے مگر کب جانے ساقی
کسی شیشے میں اب عکس رخ جاناں نہیں ملتا

سنے کیسے آخر سنائیں داستان زندگی اپنی
کوئی نا آشنائے گردش دوراں نہیں ملتا

در جاناں پہ سجدے تو لٹاتا ہوں شفیق اب بھی
مگر میری جبیں کو جذبۂ ایماں نہیں ملتا

عارف اعظمی

معلقاتِ سبعہ

یہ چند طویل منتخب قصیدوں کا ایک مجموعہ ہے جسکو حماد الراویہ (۹۵ھ۔۱۵۵ھ) نے جاہلی شعراء کے کلام سے انتخاب کرکے اکٹھا کیا ہے۔ اور اس کا نام "السموط" رکھا(۱)

معلقات کے شعراء کی تعداد ادباء کے مابین کافی مختلف فیہ ہے۔ زیادہ تر خیال یہ ہے کہ وہ سات ہیں۔ یہ شعراء امرؤ القیس، طرفہ بن العبد، زہیر بن ابی سلمیٰ، لبید بن ربیعہ، عمرو بن کلثوم، عنترۃ بن شداد اور حارث بن حلزہ ہیں۔ مفضل الضبی نے موخر الذکر دونوں شاعر عنترۃ اور حارث کی جگہ نابغہ اور اعشیٰ کو ذکر کیا ہے۔ اور اسی کو صحیح بتلایا ہے(۲) بعض لوگ ان سبھی شعراء کو جمع کرکے معلقات کی تعداد نو شمار کرتے ہیں۔ اور تبریزی (متوفی ۵۰۲ھ) نے ان نو شعراء کے ساتھ عبید اللہ بن الابرص کا اضافہ کرکے اس کی تعداد دس مکمل کردی(۳)

معلقات کے متعدد اسماء کتابوں میں ملتے ہیں۔ جن میں اس کے اہم نام یہ ہیں۔

۱۔ المعلقات السبع۔ ۲۔ السبع الطوال۔ ۳۔ القصائد السبع الطوال الجاہلیات ۴۔ السبعیات ۵۔ المعلقات العشر الجاہلیت ۶۔ السموط ۷۔ المشہورات ۸۔ المذہبات۔

ان اسماء میں "المعلقات السبع" زیادہ مشہور ہے۔

اس شعری مجموعہ کی "معلقات" وجہ تسمیہ کئی ایک بیان کی جاتی ہے۔

۱۔ ابن رشیق، ابن عبد ربہ، اور ابن خلدون وغیرہ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ سوق عکاظ کی شعری مجلس میں جس شاعر کا قصیدہ سب سے عمدہ اور برتر تسلیم کیا جاتا تھا اس کو ریشم کے کپڑے پر سونے کے پانی سے لکھ کر خانہ کعبہ کے کھمبوں یا پردے پر لٹکایا

جاتا تھا۔ اور وہ قصیدہ "معلقہ" کہلاتا تھا(۱)

اس خیال کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ عربوں کے یہاں دور جاہلیت میں بلکہ عہد اسلام میں بھی اہمیت کی حامل دستاویزات خانہ کعبہ پر لٹکانے کا رواج تھا۔ جیسا کہ قریش نے بنو ہاشم کے مقاطعہ کا معاہدہ بیت اللہ پر لٹکایا تھا۔ جس کا ذکر تفصیل سے سیرت و تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے۔ اسی طرح عباسی خلیفہ ہارون رشید نے بھی اپنے بیٹوں امین اور مامون کی ولیعہدی کا اعلان اس پر آویزاں کروایا تھا(۲)

۲۔ اس کے برعکس بعض لوگ اس وجہ تسمیہ کا انکار کرتے ہیں۔ اور ان قصائد کے بیت اللہ پر لٹکائے جانے کے قائل نہیں ہیں(۳) بلکہ اس نام کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ہر زمانہ میں ان قصائد کا عوام و خواص اور ادباء سے گہرا ربط و تعلق رہا ہے۔ لہٰذا اسی مناسبت سے یہ قصیدے "معلقات" کے نام سے موسوم ہو گئے۔ کیونکہ معلقات "تعلیق" سے مشتق ہے اور یہ مصدر عشق اور شدید محبت و لگاؤ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ لوگوں کے شدید تعلق اور عشق و جنون کی حد تک ان سے دلچسپی کی وجہ سے یہ نام چل پڑا ہو۔

۳۔ نیز اس کی وجہ تسمیہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ دور جاہلیت میں کسی بادشاہ کو اگر کوئی قصیدہ پسند آجاتا تھا تو وہ کہتا "علقوا لنا ہذہ" یعنی "اسے ہمارے لئے لٹکا دو۔" اور وہ قصیدہ اس کے خزانے میں محفوظ کر لیا جاتا اور اسکو "معلقہ" کہا جاتا تھا۔ اس طرح کے واقعات حیرہ کے بادشاہ نعمان بن منذر کی طرف منسوب ہیں۔

۴۔ ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ عرب چونکہ زمانہ جاہلیت میں کپڑوں اور کھالوں کے ٹکڑوں پر لکھا کرتے تھے اس لئے ممکن ہے کہ چوہوں اور حشرات الارض سے حفاظت کی غرض سے ان مکتوبات کو گھروں کی دیوار یا خیموں کے ستونوں پر ٹانگ دیا کرتے رہے ہوں۔ اور وہ "معلقات" کے نام سے مشہور

۱۔ ملاحظہ ہو جرمن مستشرق "کارل بروکلمان" کی کتاب "تاریخ الادب العربی" عربی ترجمہ جلد ۱ ص۶۹

۲۔ العمدۃ۔ ابن رشیق۔ جلد ۱ ص۹۶ ۳۔ تاریخ الادب العربی۔ کارل بروکلمان۔ ص۶۹

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ العمدۃ۔ جلد ۱ ص۹۶۔ العقد الفرید۔ جلد ۶ ص۱۲۳ مقدمہ ابن خلدون۔ فصل ۵۸۹

۲۔ دولۃ بنی العباس۔ ڈاکٹر شاکر مصطفیٰ ص۳۳ (۳) العمدۃ۔ جلد ۱ ص۹۶

۴۔ ملاحظہ ہوں۔ نزہۃ الالباء ص۲۳۔ اور النحاس کی "شرح المعلقات"

ہو گئے ہوں۔

مؤخر الذکر تینوں روایتیں اس امر پر متفق ہیں کہ یہ قصیدے خانہ کعبہ پر نہیں لٹکائے گئے تھے۔ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ خانہ کعبہ کی عمارت کی تجدید کے وقت جس کا واقعہ تفصیل سے تاریخ کی کتابوں میں آتا ہے ان معلقات کا کوئی ذکر نہیں ملتا نیز جاحظ، مبرد، ابو الفرج اصفہانی، زوزنی اور تبریزی نے اپنی کتابوں میں ان قصائد کو "معلقات" کا نام نہیں دیا ہے بلکہ دلچسپ بات یہ ہے کہ تقریباً تمام ہی عربی زبان وادب کی کتابوں میں اس مجموعہ کے مختلف اسماء تیسری صدی کے آخر تک جو ملتے ہیں ان میں "معلقات" کا وجود نہیں ہے۔ بلکہ اس وقت تک کی کتابوں میں اس کے صرف تین نام ملتے ہیں۔

۱۔ السموط۔ یہ اس کا پہلا نام ہے جو حماد نے اس کے انتخاب کے وقت رکھا تھا۔

۲۔ السبع الطوال۔ یہ مفضل الضبی کا موسوم کردہ نام ہے۔

۳۔ السبعیات۔ اسکو باقلانی نے "اعجاز القرآن" میں ذکر کیا ہے۔ (۱)

وجہ تسمیہ میں اس اختلاف کے باوجود تقریباً تمام ادباء اس مجموعہ کی اصالت وقدامت اور عہد جاہلی کی طرف اس کی نسبت پر متفق ہیں۔ اور اسی وجہ سے یہ مجموعہ ہر دور میں ادباء بلکہ مفسرین ونحاۃ کی دلچسپی کا خاص مرکز ومرجع رہا ہے۔

معلقات کی اہمیت کی وجہ سے اس کی مختلف ادوار میں بے شمار شرحیں لکھی گئی ہیں۔ جن میں اہم یہ ہیں (۲)

۱۔ شرح ابی بکر عاصم بن ایوب البطلیوسی متوفی ۴۹۴ھ
۲۔ ابی بکر محمد بن قاسم الانباری۔ متوفی ۳۲۸ھ
۳۔ احمد بن محمد النحاس۔ متوفی ۳۳۸ھ
۴۔ الحسین بن احمد الزوزنی۔ " ۴۸۶ھ
۵۔ یحییٰ بن علی التبریزی۔ " ۵۰۲ھ

نیز اردو، انگریزی اور فارسی کے علاوہ مختلف عالمی زبانوں میں اس کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ اور اس پر مختلف زبانوں میں بے شمار مقالے اور مضامین لکھے گئے ہیں۔

—— بقیہ علم کی اہمیت ——

اللہ تعالیٰ ہمیں زیادہ سے زیادہ علم دین حاصل کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

(۱) اعجاز القرآن۔ صفحہ ۱۵۹ (۲) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ ۱۔ تاریخ الادب العربی۔ کارل بروکلمان جز ا صفحہ ۹۶-۹۹۔ ۲۔ کشف الظنون۔ حاجی خلیفہ۔ جلد ۲ صفحہ ۱۷۳

جاوید احمد خان

ماسٹر عبدالمجید صاحب (مرحوم)

* ایک درخشاں سی شخصیت کا خوبصورت تذکرہ — جس کی زندگی تین چوتھائی صدی پر محیط رہی اور جس نے ہزاروں تشنگان علم کو سیراب کیا۔ جس نے اپنی آنکھوں سے اپنے ہی شاگردوں کو بام عروج پہ پہنچتے دیکھا اور پستیوں میں گمنام ہوتے ہوئے پایا — جس کی زندگی کبھی شعلہ تھی کبھی شبنم — جو جماعت کا ہمدرد، رفیق اور دائمی ممبر بھی رہا اور قافلہ اسلامی کا ہمدم اور رازداں بھی — کینہ وبغض وحسد سے دور اور حق بات کو برملا کہنے والا — جس نے اپنی زندگی کو اسلام کے لئے وقف کر دیا تھا اور جس کی شاگردی کا شرف ونیاز راقم کو بھی حاصل رہا۔ اب وہ اس دنیا میں نہ رہا — خدا اسے غریق رحمت کرے آمین ——

ایڈیٹر ۔۔

غالباً میں چھوٹی جماعت کا طالب علم تھا اور ایک دن ریاضی کے سوال میں غلطی کی تھی جس کے آخر میں میرے شفیق استاد نے میری دائیں ہتھیلی پر تمباکو اور چونے کا مخلوط مسالہ رکھ کر اپنی شہادت کی انگلی سے دور ایک کلاس روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ جاؤ یہ اس کالی شیروانی والے ماسٹر صاحب کو دیکر آؤ۔ میں نے تمباکو مٹھی میں دبایا اور بچپن کے اس عذاب سے جسے عام فہم زبان میں [illegible] کہتے ہیں، تھوڑی دیر کا چھٹکارا پاکر اچھلتا کودتا کالی شیروانی والے استاد کے پاس پہنچا۔ ان کے پورے جثے کو دیکھا اور پاس ہی کرسی پر رکھی ہوئی چھڑی پر نگاہ ڈالی اور ان کے سامنے ہاتھ بڑھا کر اپنی وہ مٹھی کھول دی جس میں تمباکو تھا۔ نہ میرے پیر میں جوتے تھے اور نہ چپل اور نہ آداب خوش کلامی۔ انھوں نے میری طرف کب دیکھا اور کیسے تمباکو ان کی ہتھیلی میں پہنچ گیا اس کا

مجھے علم نہیں، سنا ہے شیر جنگل میں جب بندروں کی طرح دیکھتا ہے تو وہ مارے خوف کے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور درخت سے ٹپک کر شیر کے جنگل میں آ جاتے ہیں۔ دوسرے ہی لمحہ میں کالی شیروانی والے استاذ کے جنگل میں تھا۔ ان کا ایک بید برسے کمر و سر پر ہاتھ میری گردن پر اور اُن کے ایک ہلکے دھکے سے ڈیسا پر میں جا گر پڑا۔ مجھے اپنی کیفیت معلوم نہیں ہوئی لیکن ان کے تمام شاگرد، جو پاس ہی بیٹھے تھے ہنس پڑے۔ پھر انھوں نے فارسی میں کہا «بندۂ نا تراش» جس کا مطلب مجھے کافی بعد میں معلوم ہوا۔

یہ میری ماسٹر صاحب سے پہلی مڈبھیڑ تھی۔ اور یہ بھی مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ماسٹر صاحب اپنے شاگردوں کا استقبال کچھ اسی طرح کرتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے شاگرد انھیں فراموش نہیں کر پاتے۔ میں بھی ماسٹر صاحب کے سایہ سے ڈرنے لگا میں نے محسوس کیا کہ میری عمر کے زیادہ تر طالب علم ان کی آنے کی سنسناہٹ سے چونک جاتے تھے۔ جس نے بھی ماسٹر صاحب کو دیکھا ہے وہ نہیں بھول سکتا کہ وہ ایک کسرتی بدن والے مضبوط ہاتھ اور گرجدار آواز کے مالک تھے۔ ان کو دیکھتے ہی کہہ سکتا تھا کہ اکھاڑے اور جوٹ کی تربیت سے گزرے ہوئے ہیں۔

ماسٹر صاحب نے اس صدی کی ابتداء میں آنکھ کھولی تھی۔ انھیں فخر تھا کہ وہ پہلی جنوری سنہ ۱۹۰۱ء کو پیدا ہوئے ہیں۔ جن لوگوں کو ان کے پاس بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ ماسٹر صاحب کو یاد کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد شاید اتنی ہی ہو جتنے انسانی مرتبے ہوتے ہیں۔ لیکن وہ کوئی اتنے بڑے آدمی نہیں تھے کہ اُن پر کتابیں لکھی جائیں یا ان کی شخصیت پر سمینار ہو۔ وہ ایک معمولی آدمی تھے جنہوں نے علیگڑھ میں اپنی زندگی گزار دی، اپنے ہی طالب علموں کو بنتے اور بگڑتے دیکھا، ہر اچھی چیز کو سراہا، غلط بات کی پرزور مذمت کی یہی وہ آگ تھی جس سے گزر کر انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔

ماسٹر صاحب یاد آتے ہیں تو ان کے ساتھ گزرے ہوئے دن بھی یاد آتے ہیں۔ وہ ہمیں جغرافیہ، ریاضی اور گلستاں بوستاں پڑھاتے تھے۔ ہائے وہ ان کا جغرافیہ پڑھانا! اب بھی ان کا پڑھایا ہوا سائبیریا کی برفیلی چٹانوں میں سفید ریچھ کا شکار یاد ہے اور کراکٹاؤں سے چلنے والی ہواؤں کا ان کے منھ سے گرجدار آواز

میں نکلنا یاد ہے اُن کی باتوں میں فلم کی طرح تصویر کشی تھی۔ تمام طالب علم محو ہو کر ٹکٹکی لگائے ان کی باتیں سنتے تھے، سوائے اس طالب علم کے جس کی قسمت خراب ہوتی تھی۔ کیونکہ اپنی بے توجہی کے جرم میں اسے گھن اور گرج دونوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ پھر اس کے بعد مضمون پر فکر نہیں ہو سکتا تھا بلکہ خاندان اور ذات پات پر، گزشتہ دور اور موجودہ دور کے بنیادی فرق پر، اور اسطرح ہم سب مختلف طریقوں سے اپنے علم میں اضافہ کرتے رہتے۔ جب ذرا غصہ ٹھنڈا ہوتا تو بہت ہی خلوص سے سمجھاتے کہ میں طالب علموں کو کیوں مارتا ہوں۔ اور ہم لوگ ان کی بات کے قائل ہو جاتے۔ البتہ ریاضی کی گھنٹی میں بھی طالب علم بہت خوش رہتے۔ اس لئے نہیں کہ وہ اس میں دلچسپی پیدا کرتے تھے بلکہ یہ کہ آتے ہی ضرب یا تقسیم کا دو ایک لمبا سوال بول دیتے اور سورج کی طرف رخ کر کے خاموش بیٹھ جاتے۔ اور ہم لوگ سمجھ جاتے کہ اب گئے کہ تب گئے۔ ان کے اوپر نیند کا غلبہ ہوتا اور خاموشی سے آنکھیں بند کر لیتے۔ طالب علم جو کہ اس کے منتظر ہوتے اپنی آنکھیں کھول لیتے، اپنے ہونٹ سی لیتے اور گھنٹہ ختم ہونے تک ان تمام حرکتوں سے پرہیز کرتے جس سے استاد محترم کی نیند میں خلل پڑ سکتا تھا۔ جس روز شیخ سعدی کے قطعات پڑھاتے تھے تو سبھی طالب علم خوش خوش نظر آتے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ سبھی اشعار ترنم سے اور زوردار آواز سے پڑھتے تھے۔ اور شیخ سعدی کی ذاتی زندگی کا ذکر کچھ اس طرح کرتے جیسے ان کے پرانے دوستوں میں رہے ہوں۔ یہ ماسٹر صاحب کی بہت بڑی خوبی تھی۔ وہ ماضی اور حال کے بکھرے رشتوں کو اس خوبصورت طریقے سے پیش کرتے کہ کم عمر کے طالب علم تمیز نہیں کر پاتے تھے۔

ماسٹر صاحب اس وقت مجھے بہت اچھے لگے جب انھوں نے بتایا کہ وہ پریم چند کو بہت قریب سے دیکھ چکے ہیں۔ میں پریم چند کی کہانیاں پڑھ کر ان سے متاثر ہو چکا تھا۔ میں نے ماسٹر صاحب سے جاننا چاہا کہ اس عظیم ناول نگار کے شب و روز کیا تھے۔ شاید وہ میری بات سمجھ گئے۔ بولے، واہ رے پریم چند کیا سادہ زندگی تھی اس کی۔ دھوتی پہن کر باہر کنوئیں سے پانی نکال کر نہاتے تھے اور روزانہ کچھ نہ کچھ ضرور لکھتے تھے۔ پھر انھوں نے پریم چند کی نجی زندگی کا نقشہ کچھ اسطرح کھینچا کہ مجھے

یقین ہوگیا کہ پریم چند بھی اسی دنیا کے انسان تھے۔

ماسٹر صاحب کی تدریسی زندگی اتنی لمبی رہی ہے کہ انھوں نے اپنی عمر ہی میں اپنے شاگردوں کو علم کی شہرت پاکر مشہور ہوتے دیکھا اور وہ شاگرد ابھی ان کی نظر کے سامنے رہے جو گمنام زندگی گزارتے ہیں۔ ایک بار مجھے کہیں سے پتہ چلا کہ اردو کے مشہور و معروف نقاد پروفیسر احتشام حسین بھی ماسٹر صاحب کے شاگرد رہ چکے ہیں اور دلچسپ بات یہ کہ بچپن میں انھیں پڑھایا ہے۔ میں نے ایک دن موقع کو غنیمت جان کر ماسٹر صاحب کو سر راہ پکڑ لیا اور سید احتشام حسین کی ابتدائی زندگی سے متعلق کئی سوالات ایک ساتھ کیے! اس امید سے کہ ماسٹر صاحب تفصیل سے بتائیں اور خاص طور سے ان کے بچپن کے ادبی رجحانات کا ذکر کریں۔ وہ چند سیکنڈ کے لیے خاموش ہوئے اور پھر اپنی ۴۵ سالہ پرانی لٹھیا کو جو بقول ان کے سب سے معتبر ساتھی ہے، اپنی ٹھوڑی پر لگا کر ٹیک لیتے ہوئے بولے بھئی احتشام کا میں نے ختنہ کرایا ہے، ان کے گھریلو جاگیردارانہ ٹھاٹ دیکھے ہیں اور یہ کہ بچپن ہی سے ان کے اندر تحقیق و تفتیش کا جذبہ تھا۔ ظاہر ہے اتنی ساری معلومات میرے لیے کافی تھیں۔

ماسٹر صاحب بچوں کی نفسیات کے ماہر تھے۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار تدریس کے دوران کیا کرتے تھے۔ اگرچہ کہ وہ اپنے غصے کیلئے مشہور تھے لیکن کمزور طالب علم پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔ ہاں اگر کسی طالب علم کے بارے میں پتہ چل جاتا کہ وہ فتنہ گری کر رہا ہے تو کچھ ایسی سزا دیتے جس سے اس کا رشتہ اُن سے دائمی ہو جاتا۔ ہم سب کو سمجھاتے کہ پڑھنے کے ساتھ کھیلنے پر بھی توجہ دو اور اس کا جواز اس شعر میں پیش کرتے۔

تیز ہو جاتے ہیں بچے کھیل سے
جس طرح گاڑی کے پہیے تیل سے

انھوں نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ گورنمنٹ اسکول میں گزارا، بعد میں اسلام سے گہری وابستگی پیدا کرلی اور باقی حصہ مدرسے کی نذر کر دیا۔ وہ اسلامی روایات کے بہت قائل تھے لیکن بے جا مذہبی بحث مباحثے سے اُتنا ہی دور بھاگتے تھے جتنا شیطان متقیوں سے بھاگتا ہے۔ کلاس میں کہا کرتے تھے کہ ہماری قوم کی بدنصیبی یہ ہے کہ لوگ کوا کو حلال اور حرام کی بحث میں لگے ہوئے ہیں۔

ماسٹر صاحب کے اندر ایک جوانمرد انسان

کا سا جذبہ تھا جس کے اندر بہادری اور غصہ بھی ہوتا ہے اور انسان کو تکلیف میں دیکھ کر ٹپ ٹپ آنسو بہانے والی آنکھیں بھی۔ شاید ایسے ہی لوگوں کے بارے میں روسی ناول نگار چیخوف نے کہانیاں کہہ کر نوبل انعام حاصل کیا ہو۔ انسان اچھا اسی وقت لگتا ہے جب تک وہ اپنی فطرت کے مطابق رہتا ہے۔ صناعی اور بناوٹ کا لباس اس کی حقیقی زندگی کیلئے قاتل ہے۔ ہماری معاشرت میں یہ جذبہ بڑی حد تک نمایاں نظر آتا ہے۔ ہم اپنی اصلیت چھپا کر ایک دوسرے کو فریب دینے والی قوم بن کر رہ گئے ہیں۔ انسان بقول ہرسٹم کے مجموعۂ اضداد ہے۔ اس کے اندر جوش کا جذبہ تحریک کا موجب ہوتا ہے۔ وہ تلوار کی طرح فولادی اور ریشمین دھاگوں کی طرح کمزور ہوتا ہے۔ مجھے ایسے آدمیوں سے کافی دلچسپی ہے۔ کچھ لوگ مشہور اور برگزیدہ آدمیوں کے اندر کوئی خامی یا برائی سننے کیلئے تیار نہیں ہوتے لیکن آدمی قریب سے ہی حقیقی معلوم ہوتا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر انسانوں کو [illegible] میں دیکھنے سے گھبراہٹ ہوتی ہے اور [illegible] بھی اس طرح کچھ لوگ مشہور شخصیتوں سے مصافحہ کے خواہاں ہوتے ہیں۔ بڑے اور مشہور لوگوں کو سمجھنا اور پرکھنا بڑا مشکل کام ہے کیونکہ ان کی شخصیت متعدد خولوں میں پیش ہوتی ہے اور وہ فنکارانہ انداز میں عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ آپ مشہور بڑے لوگوں سے مل کر دھوکہ کھا سکتے ہیں لیکن ایک معمولی آدمی میں اس کا سب کچھ صاف صاف دکھائی دے گا۔

ہم لوگوں نے ماسٹر صاحب کی ریٹائرڈ زندگی دیکھی تھی۔ البتہ ایام جوانی یا یوں کہیے کہ ایک پٹھان کی طغیانی نہیں دیکھی۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہی تھا۔ ورنہ خود ان کی زبان سے بیان کئے ہوئے انھیں کے حالاتِ زندگی اتنے دلچسپ نہیں معلوم ہوتے۔ اُن کے شاگردوں کو اندازہ ہے کہ جب وہ آتش فشاں پہاڑ کا ذکر کرتے اور اپنے ہاتھ پاؤں اور آواز کی مدد سے بھاپ بن کر زمین کے پھٹنے کا منظر اس طرح بیان کرتے جیسے کلاس روم کے اندر زلزلہ آگیا ہو۔ ایک مرتبہ ان کا پڑھانے کا موڈ نہیں تھا تو کہنے لگے کہ آج کون سی تاریخ ہے۔ کسی طالب علم نے کہا ۴ فروری، پھر وہ اپنا دونوں پیر کرسی پر رکھ کر اپنے گاؤں کی ڈکیتی کا وہ قصہ بیان کرنے میں مصروف ہو گئے جس میں انھوں نے بہرو

کاریوں ادا کیا تھا اور دو تین ڈاکوؤں کو زندہ پکڑا تھا، چھوٹ کھائی تھی، ایک کنویں پر سے چھلانگ لگائی تھی، جس کے نتیجہ میں انگریزی حکومت سے اعزاز حاصل کیا تھا۔ ایک گھنٹہ کا یہ بیان سننے والے کو یا تو ان کی بہادری کا قائل کر دیتا یا پھر اپنی بزدلی کا، کیونکہ پوری داستان میں کوئی ہم کردار ایسا نظر نہیں آتا تھا جس نے انھیں کی طرح اس معرکے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہو۔

ماسٹر صاحب کا ذکر گوشت کے بغیر ممکن نہیں۔ انھیں گوشت اور میٹھے سے جتنی محبت تھی اتنا کریلے سے نفرت۔ کہتے تھے کہ اگر میں مر جاؤں تو میرے پاس پکا ہوا گوشت ایک پیالے میں رکھ دینا۔ ہم سب پوچھتے کہ پھر کیا ہوگا؟ کہتے کہ گوشت دیکھ کر فوراً کھڑا ہو جاؤں گا۔ وہ گوشت کے معاملے میں معیار کے قائل نہیں تھے بلکہ مقدار کے۔ مرحوم نے اپنے ذوق کو آخر دم تک برقرار رکھا۔ بیمار ہوتے تو ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود بھی نہیں مانتے اور کہتے۔

دال روٹی تھوڑی دی، شکر شکر کر دی
عادت خدا خراب ہی کر دی

ان کی گوشت خوری کا منظر شادی بیاہ میں یا پھر بقر عید کے دنوں دیکھنے میں آتا۔ آواز میں گڑگڑاہٹ ہوتی، خوشی کا پٹارہ نظر آتے۔ خوش اخلاقی سے پیش آتے۔ اس کے برعکس رمضان کے دنوں میں ان کی اضطراری کیفیت دیکھنے لائق ہوتی جب اُن پر بھوک کا غلبہ ہوتا۔ ضبط کرنے کے باوجود بھی ضبط نہ کر پاتے، مجبوراً صبر اور خاموشی سے کام لیتے۔

ماسٹر صاحب سے دور ہو جانے کی وجہ میری علی گڑھ میں تعلیمی زندگی تھی، لیکن جب بھی سال چھ مہینے میں اُن سے ملاقات ہوتی تو یہ تحت الشعور میں پوشیدہ بات یاد آتی جو اُن سے پہلی مڈبھیڑ کے دوران ہوئی تھی، لیکن یہ ایک نفسیاتی خلل تھا اور اب اُن کی شفقت اور انسانیت کو دیکھ کر یہ اعتماد ہوتا تھا کہ نوجوانوں کی جتنی صحیح اور صالح تربیت برگزیدہ شخصیتوں سے ملتی ہے اُتنی کتابوں اور لکچر سے نہیں ملتی۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ جب تک آپ کے دل میں کسی بڑے عقیدہ، ارادہ، مقصد یا شخصیت کا احترام نہ ہوگا نہ آپ اپنے لئے کسی مصرف کے رہیں گے اور نہ کسی دوسرے کیلئے۔

جب میں علی گڑھ سے اپنے گھر آتا تو

ماسٹر صاحب سے پہلی ملاقات عموماً مسجد میں ہوتی تھی۔ دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے۔ پوچھتے کب آئے ہو۔ پھر گھر پر ملاقات ہوتی۔ ایک بار کافی دنوں کے بعد ملاقات ہوئی۔ پوچھا کیا کر رہے ہو۔ میں نے بتلایا کہ ایم اے کر لیا ہے اور غیر سودی بنکاری تحقیق کیلئے دوڑ بھاگ کر رہا ہوں۔ سنا تو آنکھوں میں خوشی کی ایسی چمک ہوئی جو قلب میں ترقی معلوم ہوتی تھی۔ کہنے لگے کہ میں کل آؤں گا تو مجھے اسلامی بنکاری کے بارے میں تفصیل سے بتائیے۔ اور جب حسب وعدہ وہ دوسرے روز آئے اور میں نے انھیں بتانا شروع کیا اسی دوران حلوہ اور چائے آگئی پھر وہ اپنی توجہ میری طرف مرکوز کرنے میں ناکام ہو گئے اور جب فارغ ہوئے تو نماز کا وقت ہو گیا۔ وہ مسجد کے متولی تھے، روحانی اور جسمانی دونوں لحاظ سے مسجد میں ان کا دخل ہوتا تھا۔ لیکن جو چیز سب سے اہم تھی وہ اُن کی اذان تھی۔ میں نے اب تک اُتنی پُر زور اور پُر سوز آواز میں اذان نہیں سُنی۔ آندھی ہو یا طوفان، بارش ہو یا کڑاکے کی سردی لیکن "الصلوٰۃ خیر من النوم" کا پیغام سب کے کانوں میں پہنچا کر بیدار کرتے۔

ماسٹر صاحب اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والے دنوں میں لوگ انھیں بھول جائیں گے۔ لیکن اس سے کیا ہوا جب تک وہ زندہ رہے اُن میں زندہ دلی تھی۔ انھوں نے اپنے اوپر کبھی بڑھاپا غالب نہیں آنے دیا۔ وہ بچوں کی طرح خوش رہنا جانتے تھے۔ اپنے اوپر ہنسنے اور اپنے آپ سے مطمئن رہنے کا سلیقہ انھیں معلوم تھا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں جب انھوں نے سر کی تکلیف کی وجہ سے سائیکل چلانا چھوڑ دیا تو اپنی پرانی لٹھیا کے سہارے چلتے پھرتے تھے۔ وہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ ایک بار میرے گھر آئے تو میں نے انھیں تازہ تازہ خستہ پیش کیا۔ بہت خوش ہو کر دو تین کھایا اور باقی کو کاغذ میں لپیٹ کر اپنی صدری کی جیب میں رکھ لیا۔ ان کے ہونٹ پر مسکراہٹ پھیلی اور دھیمی آواز میں بولے کہ اپنی بڑھیا کو دوں گا۔ اور مجھے اتنا بڑا سبق دے گئے جو کتاب کے ذریعہ ممکن نہیں۔ پھر میں نے وہ دن بھی دیکھا جب وہ اپنی بڑھیا کو قبرستان لے جا رہے تھے۔ جیسے خدا کی

بقیہ صفحہ ۶۰ پر

ھو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

عبدالباری فلاحی
رضوانہ

حلقۂ یاراں

جناب ایڈیٹر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔ چند دنوں قبل آپ کے پاس میں نے ایک خط لکھا تھا۔ جسمیں حیات نو کی خامیوں کی نشاندہی کی تھی خدا کا شکر ہے کہ اب وہ خامیاں اور کمیاں کسی حد تک دور ہو چکی ہیں۔ یہ آپکی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ پرچہ کا معیار روز بروز بڑھ رہا ہے اور پرچہ مقبول عام ہو رہا ہے اسکا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آپ مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کتابت طباعت اور علمی معیار بلند سے بلند تر پیدا کیا جائے

عبدالباری ۸ جون ۱۹۸۳ء

جناب ایڈیٹر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

چند مخلصانہ گزارشات پیش خدمت ہیں۔

- حیات نو کا سرورق اسلامی آرٹ کا نمائندہ ہو۔ کیونکہ اندر خواہ کچھ نہ ہو۔ پرچے سرورق ہی پر خریدے جاتے ہیں۔ آج کے قاری کا یہی مزاج بن گیا ہے۔
- حیات نو کی پیشانی پر ایک نمائندہ شعر ہو۔
- ۱۹۸۴ء نوجوانوں کے سال پر رہنما تحریریں خطوط کار فلاحی ماہرین، کہنہ مشق ادیبوں اور ادیباؤں سے لکھوائے جائیں۔
- نوجوانوں کی بے راہ روی دور کرنے کے لئے رہنما اور ولولہ انگیز منظومات ہوں۔
- خواتین ادیباؤں اور شاعرات سے خواتین کا صفحہ قائم کرکے لکھوائیں۔
- بچوں کا ادب ادارہ حیات نو تیار کرے۔
- مختصر چٹکلے والی اور فکر انگیز بنانے والی کارآمد تحریریں دیں تاکہ کم وقت والے اصحاب مستفید ہو سکیں۔
- فہد فلاحی اور تمام ادیبوں اور شاعروں سے ترقی خطوط کار اور نوجوانوں پر مضامین لکھوائیں۔

فقط

رضوانہ

نجی الیف فلاحی

جامعہ کے لیل و نہار

جامعۃ الفلاح نے اس بار کچھ زیادہ ہی وسعت قلبی اور کشادہ دلی کا مظاہرہ کیا ہے آنے والے طلبہ کے لئے وہ اپنی آغوش مسلسل کشادہ کرتا رہا ہے۔ مودودی ہاسٹل، فاروقی بورڈنگ، قاسمی اور نوری بورڈنگ ہاؤس تمام کے تمام طلبہ سے بھری ہوئی ہیں۔ طلبہ کے شوق کا یہ عالم ہے کہ وہ برآمدے میں قیام کے لئے آمادہ ہیں اور کچھ ہیں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

ہندوستان کے مختلف گوشے سے آئے ہوئے متلاشیان علم اس بات کی دلیل ہیں کہ جامعۃ الفلاح ایک ادارہ بلکہ ایک تحریک کی حیثیت سے ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ اور اس کا یہ منصوبہ کہ قرآن اور حدیث کا گہرا علم اور اسلام کی صحیح فکر اور تڑپ دینے کے ساتھ ساتھ جدید علوم پر طلبہ کی گرفت مضبوط کی جائے کامیاب اور مقبول ہوتا جا رہا ہے۔

- طلبہ کی تعلیم و تربیت کے علاوہ ان کی تقریری، تحریری، انتظامی صلاحیتوں کو ابھارنے کے لئے انکی ایک "جمعیۃ" بنائی گئی ہے جسکا ہر سال انتخاب ہوتا ہے چنانچہ اس سال بھی انتخاب عمل میں آیا اور نظام الدین نیپالی کو سکریٹری منتخب کیا گیا۔ نیز، اردو، عربی، انگلش، تحریر و تقریر اور مطبخ، صفائی اور گیم کے لئے الگ الگ معتمد منتخب کئے گئے۔
- یہ بات بڑی خوشی کی ہے کہ مولانا ضیاء الرحمن صاحب اعظمی کی آمد پر ۹ جولائی ۱۹۸۳ء کو ایک پروگرام رکھا گیا۔ جسمیں تمام طلبہ اور اساتذہ شریک رہے۔ موصوف نے علم حدیث کے اوپر طویل گفتگو کی آپ نے فرمایا کہ علم حدیث قرآن کی مستند ترین شرح ہے قرآن کو حدیث سے الگ

کر کے سمجھا نہیں جا سکتا قرآن خود حقیقتوں کا خزانہ ہے لیکن حدیث کے بغیر اس خزانہ کا حصول ناممکن ہے۔ جن لوگوں نے بھی قرآن کو حدیث سے الگ کر کے سمجھنے کی کوشش کی وہ صراط مستقیم سے دور ہو گئے۔

آپ نے زور دیتے ہوئے کہا کہ حدیث کے اندر جہاں بھی کلمہ علم بالفظ علم استعمال ہوا ہے اس سے مراد صرف اور صرف علم حدیث ہے جیسے من خرج فی طلب العلم..... الی آخر۔ گفتگو کو طول دیتے ہوئے آپ نے فرمایا دوسری صدی ہجری میں جب یونانی فلسفہ اور منطق اسلام میں داخل ہوئے اسی وقت مختلف فرقے وجود میں آگئے اور انھوں نے حدیث کے اوپر طرح طرح کے اعتراضات کیے۔ ان میں سے ایک مشہور اعتراض یہ ہے کہ جس وقت قرآن کا نزول ہو رہا تھا اور علم حدیث وجود پذیر ہو رہا تھا۔ مکہ میں صرف ۱۷ آدمی لکھنا اور پڑھنا جانتے تھے۔

جاء الاسلام و لیس فی مکۃ الا سبع عشر رجلا کلھم یکتبون"

آپ نے بتایا کہ یہ بات غلط ہے کیونکہ بلاذری نے فتوح البلدان میں جن سترہ ناموں کا ذکر کیا ہے اس میں حضرت ابوبکرؓ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص اور بعض عورتوں کے نام نہیں لیا ہے جن کے بارے میں صراحت سے یہ بات موجود ہے کہ وہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

اجتماعی اور دینی اعتبار سے مکہ تمام عرب کا مرکز تھا جہاں سے تاجروں کے قافلے گزرتے تھے لہذا یہ بات بعید از قیاس ہے کہ ایک ایسی جگہ جو ام القریٰ ہو وہاں صرف ۱۷ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے ہوں۔

ادبی حیثیت سے بھی یہ بات غلط ہے کیونکہ سوق عکاظ میں ان کا ہر سال ادبی میلہ لگا کرتا تھا اور ادبی چیزیں پیش کی جاتی تھیں، خالص ادبی میلہ تو آج بھی کہیں نہیں لگتا۔ لہذا یہ بات غلط ہے۔

پھر قرآن کی پہلی آیت اقرأ سے شروع کی گئی ہے یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں ایک علمی ماحول موجود تھا۔

آپ نے بتایا کہ حدیثوں کو بڑی محنت اور جانفشانی سے جمع کیا گیا ہے۔ حضرت جابرؓ نے صرف ایک حدیث کی تصدیق کے لیے تین دن میں مصر کا سفر کیا۔

باقی صفحہ ۲۰ پر